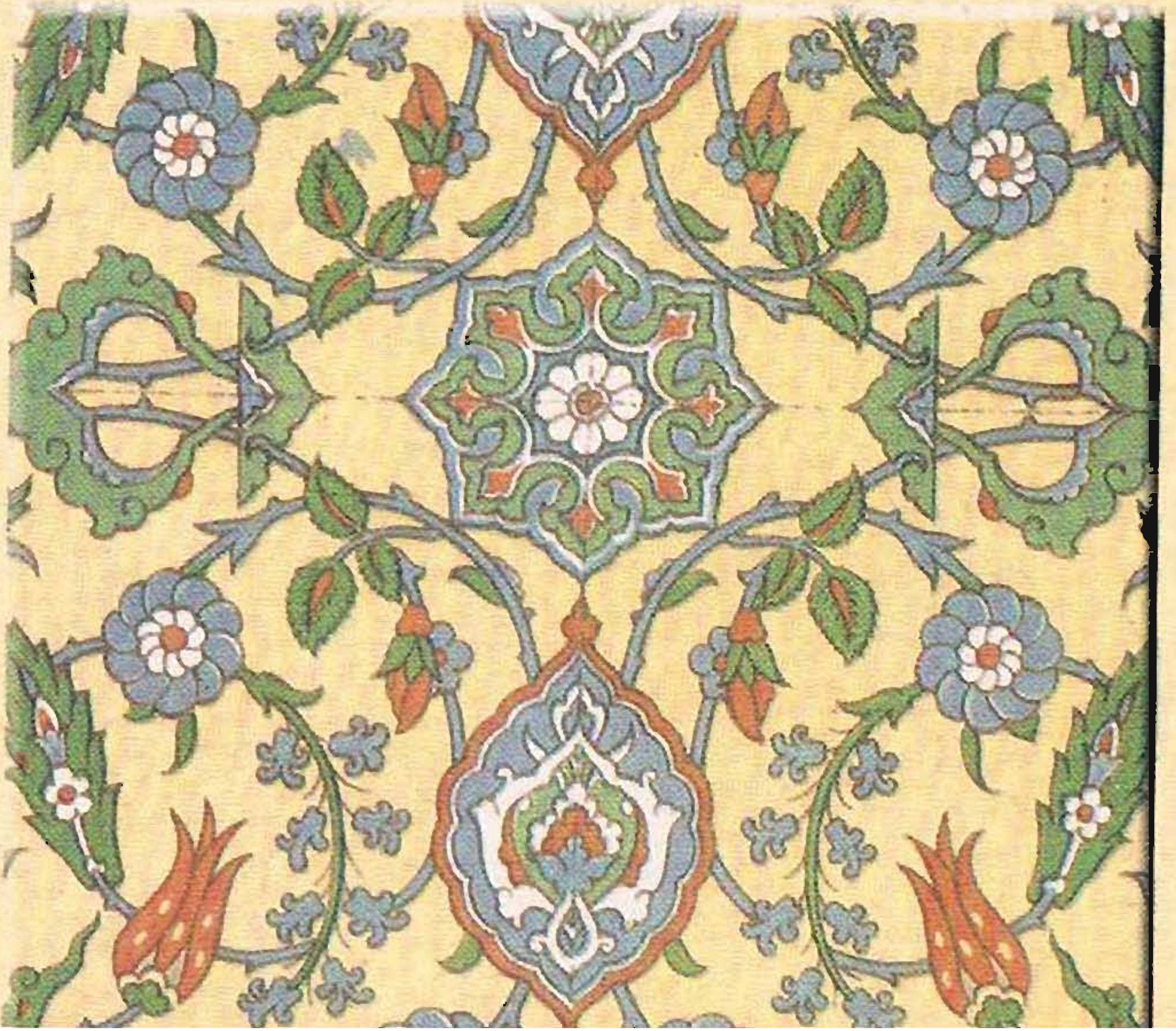
# الرسالہ
# Al-Risala

May 2001 • No. 294 • Rs. 10

سب سے بڑا قانون فطرت کا قانون ہے۔ جو چیز آپ کو
فطرت کے قانون کے تحت ملنے والی نہ ہو اس کو آپ کسی اور
ذریعہ سے حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔



# الرسالہ

*Al-Risāla*

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

**مولانا وحید الدین خاں**

صدر اسلامی مرکز

**Al-Risāla**

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 435 6666, 435 1128
Fax 435 7333, 435 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

**SUBSCRIPTION RATES**

Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

**DISTRIBUTED IN ENGLAND BY**

IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137 • Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

**DISTRIBUTED IN USA BY**

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Ave,
Cooper City, FL 33328 U.S.A.
Tel. (954) 4348404 • Fax (954) 4342551
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.


بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ مئی، ۲۰۰۱

## فہرست





# موت کی یاد

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اکثروا ذکر ھادم اللذات الموت (مشکاۃ المصابیح ۱/۵۰۴) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو کہ لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ موت کی یاد بھی ایک "ذکر" ہے۔ وہ ایک عبادتی عمل ہے۔ موت کی یاد ایک ثواب ہے جو انسان کے اعمال نامہ میں درج کیا جاتا ہے۔

ایک فارسی شاعر بوڑھا ہو گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ اس وقت اس نے یہ شعر کہا کہ موت کے ہاتھ نے روانگی کا نقارہ بجا دیا ہے۔ اے میری دونوں آنکھیں اب تم سر کو الوداع کہو:

کوسِ رحلت بکوفت دست اجل　　　　اے دو چشمم وداعِ سر بکنید

"موت آ کر رہے گی" یہ بات ان لوگوں سے کہنے کی ہے جو ابھی جوانی کی عمر میں ہوں لیکن جو لوگ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے ان کے لئے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان سے یہ کہا جائے کہ "موت آنا شروع ہو گئی"۔ جوان آدمی کے لئے موت بظاہر مستقبل کی ایک خبر ہے لیکن بوڑھے آدمی کے لئے موت حال میں پیش آنے والا ایک واقعہ۔

حقیقت یہ ہے کہ جوان آدمی اگر موت کو یاد نہ کرے تو یہ اس کے لئے غفلت کی بات ہو گی۔ لیکن جو لوگ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر بھی موت کو بھولے ہوئے ہوں ان کی یہ حالت بے حد سنگین ہے۔ یہ گویا کہ سرکشی ہے اور اللہ کے نزدیک سرکشی سے زیادہ سنگین جرم اور کوئی نہیں۔ موت کو یاد رکھنے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ ایک واقعہ کی صورت میں روز ہر آدمی کے آس پاس پیش آتی ہے۔ ہر دن یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بچپن میں مر گیا اور کوئی جوانی میں اور کوئی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر مرا۔ اس طرح ہر عمر کے لوگ اپنے جیسی عمر کے مرد و عورت کو ہر روز مرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے اس کی مثال دنیا میں موجود ہے۔ ایسی حالت میں ہر عقل مند آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو موت کے کنارے محسوس کرے۔ کسی بھی عمر کا آدمی اپنے آپ کو موت سے محفوظ نہ سمجھے۔

# جدید دعوتی امکانات

انگلینڈ کی مشہور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامی مطالعہ کا ایک ادارہ کھلا ہے جس کا نام ہے:

Oxford Centre of Islamic Studies

اس کے افتتاحی اجلاس میں پرنس چارلس نے شرکت کی اور وہاں ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو اسلام اور مغرب کے موضوع پر ایک مفصل تقریر کی۔

انھوں نے کہا کہ جس زمانہ میں ہمارے ملک میں کنگ الفرڈ مطبخی موضوعات پر کتابیں جمع کر رہے تھے اسپین کے مسلمان علم کو ترقی دینے میں مصروف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسپین کے سلطان کے کتب خانہ میں اس وقت چار لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ یہ بقیہ یورپ کے تمام کتب خانوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ تھیں۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ مسلم دنیا نے چین سے کاغذ بنانے کا فن مسیحی یورپ سے چار سو سال پہلے حاصل کر لیا تھا۔

موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب نے جو مزاج پیدا کیا ہے اس کا ایک پہلو کھلا پن ہے۔ مذکورہ اقتباس اسی کی ایک مثال ہے۔ پرنس چارلس کے الفاظ خود اپنی قوم کے خلاف ایک بیان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے نہایت کھلے طور پر اس پر اظہار خیال کیا۔ اور اس معاملہ میں مغرب کی کوتاہی اور اسلام کی برتری کی تصدیق کی۔

مغربی انسان کا یہ مزاج ہمارے لیے ایک عظیم دعوتی امکان ہے۔ شکایتی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر خالص دعوتی ذہن سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل مغرب اسلام کے لیے بہترین مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مغربی انسان کا غیر تقلیدی مزاج، اس کا کھلا پن اور اس کے اندر اعتراف کرنے کی اسپرٹ، اسلام کے لیے ایک موافق زمین کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا انسان بالقوۃ طور پر دین فطرت کے قریب آچکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اس بالقوہ کو بالفعل میں تبدیل کر دیا جائے۔

# حمیت جاہلیت

قرآن (البقرہ ۱۰۶) میں اہل نفاق کا کردار بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ——اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو وقار اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ بس ایسے شخص کے لیے جہنم کافی ہے۔ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے (وإذا قيل له اتق الله اخذته العزة بالاثم فحسبه جهنم، ولبئس المهاد)

اس آیت میں عزت سے مراد حیثیت ہے۔ اس کی تفسیر کے تحت قرطبی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک یہودی اپنی کسی ضرورت کے تحت خلیفہ ہارون رشید کے پاس ایک سال تک آتا رہا۔ مگر خلیفہ نے اس کی ضرورت پوری نہ کی، ایک دن وہ خلیفہ کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا۔ پھر جب ہارون رشید نکلا تو وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھا، یہاں تک کہ وہ آکر خلیفہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور کہا کہ اے امیر المومنین اللہ سے ڈریے۔ اس کے بعد ہارون اپنی سواری سے اترا اور سجدے میں گر پڑا۔ پھر جب اس نے اپنا سر سجدے سے اٹھایا تو یہودی کی ضرورت کو پورا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کی تعمیل کر دی گئی۔ جب یہودی واپس ہو گیا تو کسی نے کہا کہ اے امیر المؤمنین، آپ ایک یہودی کے کہنے پر اپنی سواری سے اتر گئے۔ خلیفہ نے جواب دیا نہیں بلکہ مجھے اللہ کا یہ قول یاد آگیا: واذا قيل له.... الخ (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۱۹/۳)

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی معاملہ کو اپنے لیے عزت و وقار کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ اس کو قرآن میں حمیت جاہلیہ کہا گیا ہے۔ مذکورہ واقعہ میں خلیفہ کے سامنے تقویٰ کی بات کہی گئی۔ جو بذات خود ایک درست بات تھی لیکن یہ بات ایک یہودی نے کہی تھی اس لئے کچھ لوگوں کے اندر یہ نفسیات ابھر آئی کہ اگر اس کو مانا گیا تو وہ یہودی کی بات کو ماننا ہو جائے گا۔ مگر مومن کی سوچ یہ نہیں ہوتی مومن ہمیشہ قول کو دیکھتا ہے نہ یہ کہ اس کا قائل کون ہے۔ وہ دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل بات کو پکڑ لیتا ہے۔ وہ اس کو غیرت و حمیت یا عزت و وقار کا سوال بنائے بغیر اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔

# سرکشی اور تواضع کا رویہ

اللہ تعالیٰ نے آدم کی صورت میں پہلا انسان پیدا کیا تو اسی وقت اس کو یہ بھی بتادیا کہ دنیا میں اس کو کس طرح رہنا ہے۔ اس کا مختصر بیان قرآن کی سورہ البقرہ (رکوع ۴) میں موجود ہے۔ اس معاملہ کے چند اجزاء یہ ہیں — شجر ممنوعہ، سجدہ کا معاملہ، اور یہ کہ بعضکم لبعض عدو اور توبہ۔

آدم اور ان کے واسطہ سے نسل آدم کو آغاز حیات ہی میں ہدایت کا وہ بنیادی سبق دے دیا گیا جو انسان کی ابدی فلاح یا خسران کے لئے فیصلہ کن بننے والا تھا۔

شجر ممنوعہ کو بائبل میں "نیک و بد کی پہچان" کا درخت بتایا گیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے تاہم وہ علامتی معنوں میں ہے، جنت میں آدم کو جس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا وہ ایک علامتی درخت تھا۔ یہ درخت گویا درخت تمیز تھا۔ وہ اس بات کی علامت تھا کہ اس دنیا میں آدمی کو ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان "فرق" کر کے رہنا ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز ممنوع ہے اور کوئی چیز غیر ممنوع۔ اس لئے ممنوع اور غیر ممنوع کے درمیان فرق کرنا۔ غیر ممنوع کو لیتے ہوئے ممنوع کو چھوڑ دینا۔

اس دنیا میں ایک رویہ سرکشی کا رویہ ہے اور دوسرا تواضع کا رویہ۔ اس لئے سرکشی (ابلیس) کے رویہ اور تواضع (فرشتہ) کے رویہ میں فرق کرنا۔ تواضع کو اختیار کرتے ہوئے سرکشی کو چھوڑ دینا۔ اس دنیا میں ایک اور دوسرے کے درمیان عداوت کے حالات پیدا ہوں گے۔ اس لئے یہاں ایک مثبت رد عمل ہوگا اور دوسرا منفی رد عمل۔ دونوں میں فرق کرتے ہوئے مثبت رویہ کو اپنانا اور منفی رویہ کو چھوڑ دینا۔

اس دنیا میں انسان غلطی بھی کرے گا۔ اس کے بعد ایک رویہ اعتراف کا ہوگا اور دوسرا رویہ بے اعترافی کا۔ اب اعتراف کا رویہ اختیار کرنا اور بے اعترافی کا رویہ چھوڑ دینا۔

انسانیت کے آغاز میں پیش آنے والا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور غلط طریقہ کیا۔ ان کی کامیابی کا راز کیا ہے اور ان کی ناکامی و نامرادی کا راز کیا۔

# تبدیلی کا عمل

کائنات ایک عظیم کارخانہ ہے۔ ہم روزانہ جو خوراک کھاتے ہیں، وہ قدرت کے اس عظیم کارخانہ کی پیداوار ہوتی ہے۔اس کارخانہ کے اندر ہونے والے بے شمار عمل کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ غیر ذی روح مادی اشیاء غلہ سبزی اور گوشت وغیرہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جن کو ہم خوراک کہتے ہیں۔

اس کے بعد جب وہ پیٹ میں داخل ہوتی ہیں تو دوبارہ ایک اور تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے۔اب پورا انسانی جسم دوبارہ متحرک ہو جاتا ہے۔

اس حرکت و عمل کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ کھائی ہوئی چیزیں وہ مختلف حیاتیاتی خلیے (cells) تیار کرتی ہیں جو انسان کے جسم میں خون اور گوشت اور ہڈی اور دوسری چیزوں کی صورت اختیار کرتی ہیں۔پیٹ کے اندر ہونے والی یہ تبدیلی ہمارے وجود کو مسلسل طور پر زندہ اور متحرک رکھتی ہے۔

یہ دو تبدیلیاں وہ ہیں جو طبیعی طور پر فطرت کے مقرر کیے ہوئے نظام کے تحت پیدا ہوتی ہیں۔وہ اپنے آپ عمل میں آتی ہیں۔اور خود اپنے اندرونی قوانین کے تحت اپنی تکمیل تک پہنچتی ہیں۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ سوچے کہ خدا نے کس طرح اس کے حیات جسمانی کے لئے ایک عظیم انتظام کر دیا۔ حالاں کہ اس نے خدا سے اس کی درخواست بھی نہیں کی تھی ـــــ یہ احساس آدمی کے اندر اتنی شدت سے پیدا ہونا چاہئے کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔احساس شکر کے جذبے سے اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑیں۔اور پھر سراپا سپاس بن کر اس کی زبان سے شکر کا کلمہ نکل پڑے۔

پہلی دو تبدیلیاں نظام فطرت کے تحت اپنے آپ پیش آتی ہیں۔اور دوسری تبدیلی انسان کو خود اپنے شعور کے تحت وجود میں لانا ہے۔یہی ان خدائی نعمتوں کی قیمت ہے۔ جو شخص یہ قیمت ادا کر دے وہی خدا کی نعمتوں کے استعمال کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔

# داخلی مسئلہ

اخبار کی دو سرخی پڑھئے: "ملک میں فرقہ واریت کا بڑھتا ہوا ناسور"۔

"فرقہ وارانہ جماعتوں پر پابندی لگائی جائے۔"

ان سرخیوں کو پڑھنے والا بظاہر یہ سمجھے گا کہ یہ ہندستان کے بارے میں کوئی خبر ہے۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ پاکستان کے بارہ میں ہے۔ پہلی سرخی لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۹ اپریل ۱۹۹۲ء) کے صفحہ اول سے لی گئی ہے۔ اور دوسری سرخی نوائے وقت (۲۷ اگست ۱۹۹۲) کے صفحہ اول سے۔

پہلی سرخی کے تحت جو رپورٹ درج ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ تقسیم سے پہلے برصغیر ہند میں جب پاکستان کی تحریک چلی تو ہر فرقہ اور ہر مسلک کے لوگ آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ برصغیر ہند کی پوری مسلم قوم ایک گلستان اخوت بنی ہوئی تھی جس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگ اکٹھا ہو کر مہکتے تھے۔ مگر اسی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ آج پاکستان میں ملت اسلامیہ کا یہ اتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ آج پاکستان کے چاروں طرف فرقہ وارانہ خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں۔

پاکستانی جائزہ نگار نے لکھا ہے کہ جب "ہم سب ایک ہی گلستان کے پھول ہیں تو پھر یہ کانٹے کہاں سے آئے۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ امت اسلامیہ میں یہ کانٹے اغیار اور کفار نے پیدا کئے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی راہوں میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے اتحاد واشتراک کو پارہ پارہ کر دیا"۔

پاکستانی لیڈروں نے "اغیار اور کفار" سے الگ ہونے ہی کے لئے پاکستان بنوایا تھا۔ پھر جب انھوں نے بے شمار قربانیوں کے بعد مسلمانوں کو اغیار اور کفار کے پڑوس سے علیحدہ کر کے پاکستان بنوالیا تو اس کے بعد وہ کون تھا جس نے گلستان اخوت کو خارزار اخوت بنا دیا۔

گلستان کو خارستان بنانے کی ذمہ داری غیروں پر ڈالنا سراسر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کے مطابق، ہر فرد اور ہر گروہ خود اپنے کئے کو بھگتتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے مسئلہ کا حل خود اپنی داخلی اصلاح ہے نہ کہ مفروضہ دشمنوں کے خلاف احتجاج وفریاد۔

# اخفاء ایک سنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے مدینہ کے لئے ہجرت فرمائی تو تقریباً ۱۰ دن کے اس سفر میں بہت سے واقعات پیش آئے جو سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک عبرت انگیز واقعہ وہ ہے جو سراقہ بن مالک بن جعشم سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ قدیم عرب کا ایک شہسوار تھا۔ قریش مکہ کو جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے محفوظ طور پر نکل کر باہر چلے گئے ہیں تو انہوں نے اعلان کیا کہ جو شخص محمدؐ کو پکڑ کر لائے گا اس کو سو اونٹ کا انعام دیا جائے گا۔ سراقہ، جس نے بعد کو اسلام قبول کر لیا، اس انعام کی حرص میں آپ کی تلاش میں نکلا یہاں تک کہ وہ آپ کے قریب پہنچ گیا۔

مگر جیسا کہ روایات میں آیا ہے، اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس نے بار بار آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر ہر بار اس کے ساتھ یہی پیش آیا۔ آخر کار اس نے محسوس کیا کہ یہ معاملہ اس کے قابو سے باہر ہے اور وہ محمدؐ اور ان کے ساتھی ابو بکرؓ کو پکڑ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے دور سے چلا کر امن طلب کیا۔ نیز کچھ تحفہ پیش کرنا چاہا۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں: **فلم يرداني ولم يسألاني إلا أن قالا: اخف عنا**۔ (سیرۃ ابن کثیر ۲/۲۴۸) یعنی ان دونوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ مجھ سے کوئی سوال کیا۔ دونوں نے صرف یہ کہا کہ قریش سے ہماری بات کو مخفی رکھنا۔

اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم سنت معلوم ہوتی ہے، اور وہ ہے سنتِ رازداری۔ یہ بات عقل اور شریعت دونوں کے خلاف ہے کہ آدمی ہر بات کا اعلان کرتا رہے۔ بعض اوقات اعلان ضروری ہوتا ہے مگر بعض اوقات یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک معاملہ کو پوشیدہ رکھا جائے، عام لوگوں کو اس سے باخبر نہ ہونے دیا جائے۔ اس قسم کی رازداری ایک حکیمانہ تدبیر ہے۔

# شکایت ایک نفسیاتی کمزوری

شکایت کا سبب کوئی انسان نہیں، اس کے اسباب خود قانونِ فطرت کے اندر ہیں۔ جب بھی کچھ لوگ مل کر رہیں یا مل کر کوئی کام کریں تو لازماً ایک کو دوسرے سے ناخوش گوار تجربات ہوتے ہیں۔ یہی تجربات شکایت پیدا کرتے ہیں۔ اب جو آدمی شکایت کو فطرت کے نظام کا ایک تقاضہ سمجھے وہ اس کو نظر انداز کر دے گا۔ اور جو آدمی شکایت کو ایک شخص کا فعل سمجھ لے وہ اس کے خلاف شکایت میں مبتلا ہو جائے گا۔

کوئی بڑا کام کرنے کے لئے ہمیشہ متحدہ کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی کچھ لوگ متحد ہوں گے تو لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت بھی پیدا ہوگی۔ اب اگر ایسا ہو کہ لوگ شکایتوں کو لے کر ساتھ چھوڑ دیں تو کبھی کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا۔ بڑا کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ وہ شکایت کے باوجود متحد رہیں، شکایت کے باوجود وہ مقصد کی خاطر دوسروں سے جڑے رہیں۔

اس معاملہ کا دوسرا سخت تر پہلو ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں شکایت کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے شکایتی مزاج کے لوگ عملاً ڈبل اسٹینڈرڈ بن جاتے ہیں۔ وہ ایسا کرتے ہیں کہ جہاں ان کا گہرا انٹرسٹ وابستہ ہو، وہاں تو وہ شکایت کو نظر انداز کر کے جڑے رہتے ہیں۔ اور جہاں گہرے انٹرسٹ کا معاملہ نہ ہو وہاں وہ فوراً شکایت لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شکایتی مزاج ایک قسم کی نفسیاتی کمزوری ہے۔ اس نفسیاتی کمزوری کے ساتھ آدمی کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ حتی کہ یہ نیکی بھی اس کے لئے مقدر نہیں کہ کوئی شخص ایک بڑا کام کر رہا ہو تو وہ اس کا اعتراف کرے۔ کیوں کہ اپنے مزاج کی بنا پر اس کو کوئی نہ کوئی ایسی شکایتی بات مل جائے گی جس کا حوالہ دے کر وہ اس کو رد کر دے اور اس سے الگ ہو جائے۔

# محبت اور علم

ٹامس کارلائل (Sir Thomas Carlyle) ۱۷۹۵ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۱ میں لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا شمار مغرب کے مشہور مصنفوں میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنے تاریخی مطالعہ کی روشنی میں لکھا ہے کہ محبت کرنے والا دل تمام علوم کا آغاز ہے:

A loving heart is the beginning of all knowledge.

قول نہایت بامعنی ہے۔ مگر اس کی معنویت کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک اس میں یہ اضافہ نہ کیا جائے کہ "نفرت کے اسباب کے باوجود محبت کرنے والا"۔ کیوں کہ اس دنیا میں نفرت اور بیزاری کے اسباب ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ کوئی شخص اس وقت تک انسانوں سے محبت نہیں کر سکتا جب تک وہ اس بلند حوصلگی کا ثبوت نہ دے کہ لوگوں کی طرف سے نفرت کا تجربہ پیش آنے کے باوجود وہ ان سے محبت کرے۔

خود ٹامس کارلائل کی زندگی اس کی ایک سبق آموز مثال ہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد مغربی یورپ کے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے سخت نفرت ہو گئی۔ اس نفرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پیغمبر اسلام کی شخصیت کو پہچان نہ سکے۔ صدیوں تک وہ آپ کو ایک برا انسان سمجھنے کی نادانی میں مبتلا رہے۔ ٹامس کارلائل نے صلیبی جنگوں کے پیدا کردہ اسباب نفرت سے اوپر اٹھ کر پیغمبر اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے آپ کو پیغمبروں کا ہیرو قرار دیا اور نہایت اونچے الفاظ میں آپ کی شخصیت کا اعتراف کیا۔ ٹامس کارلائل کا یہ اعتراف اس کی کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (Heroes and Hero worship) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اپنے سینہ میں اس دل کی پرورش کرنا جو نفرت کے باوجود محبت کر سکے، خود اپنے آپ کو عظیم ترین اخلاقی بلندی کی طرف لے جانا ہے۔ یہ اخلاقی صفت ہی وہ واحد زمین ہے جس کے اوپر علم کا پودا اگتا ہے اور بڑھ کر سرسبز و شاداب درخت بن جاتا ہے۔

# یکطرفہ حسن سلوک

احنف بن قیس تابعی کا واقعہ ہے۔ ایک دن وہ بازار گئے اور اپنی ضرورت کا سامان لے کر اپنے گھر واپس جانے لگے۔ راستہ میں ان کو ایک آدمی ملا جوان سے بغض رکھتا تھا۔ وہ ان کو برا بھلا کہنے لگا۔ احنف بن قیس خاموشی کے ساتھ اس کو سنتے ہوئے اپنا راستہ چلتے رہے۔ وہ آدمی بھی ان کے ساتھ چلتا رہا اور مسلسل ان کو گالیاں دیتا رہا۔

آخر کار ایک جگہ پہنچ کر احنف بن قیس رک گئے۔ اب وہ اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہا کہ میں یہاں کھڑا ہوں۔ تم کو اور جو کچھ میرے خلاف کہنا ہے اسے کہہ لو۔ کیوں کہ اب میرا محلہ قریب آگیا ہے۔ یہاں لوگ میری عزت کرتے ہیں اور مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ مجھ کو ڈر ہے کہ ان کے سامنے اگر تم نے مجھ کو برا کہا تو وہ برداشت نہیں کریں گے اور ضرور تم کو تکلیف دیں گے۔ (قل ماعندك، فأنه قد دنا الحی واهله یُؤقروننی، و إنی لاخشی أن یُؤذوك إذا سمعوك تسببنی)

یہ ایک عظیم انسانی صفت ہے۔ جو مذکورہ واقعہ میں ملتی ہے۔ احنف بن قیس تابعی کو یہ پریشانی نہیں ہوئی کہ ایک شخص انہیں بُرا کہہ رہا ہے۔ اس کے بجائے وہ یہ سوچ کر پریشان ہوئے کہ ان کے محلے والے اگر اس بات کو جان لیں گے تو وہ مذکورہ شخص کو تکلیف پہنچائیں گے۔

یہی بات مزید اضافہ کے ساتھ داعی کے اندر پائی جاتی ہے۔ داعی کو جب اس کا مدعوگروہ ستاتا ہے اور اس پر ظلم کرتا ہے تو وہ اپنی مظلومیت سے زیادہ اس بات کے لیے فکر مند ہو جاتا ہے کہ مدعوگروہ اپنی اس بے راہ روی کی بنا پر خدا کی پکڑ میں نہ آجائے۔

یہ احساس داعی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مدعو کے خلاف بددعا کرنے کے بجائے اس کے حق میں دعا کرے۔ وہ اس سے انتقام لینے کے بجائے اس کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرے۔ وہ اس کے غلط سلوک کو دیکھ کر اس کے ساتھ اور بھی زیادہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے۔ لوگوں کے ساتھ یکطرفہ شفقت کا معاملہ کرنا، ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے اور یہ اعلیٰ انسانی صفت داعی کے اندر آخری حد تک پائی جاتی ہے۔

# منزل کا نشانہ

انگلینڈ اور فرانس کے درمیان ایک سمندری کھاڑی ہے۔ اس کو انگلش چینل کہا جاتا ہے۔ جس مقام پر اس کا پاٹ سب سے کم ہے وہاں وہ ۲۱ میل چوڑی ہے۔ اب اس کے نیچے ایک سرنگ بنائی گئی ہے جو انگلینڈ اور فرانس کے درمیان بذریعہ روڈ سفر کو ممکن بناتی ہے۔

تیراک لوگ ہمیشہ اس کے شوقین رہے ہیں کہ وہ تیر کر انگلش چینل کو پار کریں۔ سب سے پہلے ۱۸۷۵ میں ۲۷ سالہ میتھو ویب (Matthew Webb) نے تقریباً ۲۱ گھنٹہ تیرتے ہوئے اس کو پار کیا تھا۔ اس کے بعد سیکڑوں لوگ بار بار اس کو پار کر چکے ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ مختلف قسم کی کہانیاں وابستہ ہیں۔

امریکی خاتون فلارنس شاڈوک (Florence Chadwick) پہلی خاتون ہیں جنھوں نے انگلش چینل کو تیر کر پار کرنے کی کوشش کی۔ پہلی بار وہ ناکام رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو دونوں طرف سے پار کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔ فرانس کی طرف سے ۱۹۵۰ میں، اور انگلینڈ کی طرف سے ۱۹۵۱ میں۔ پہلی ناکامی کے بعد فلارنس شاڈوک نے اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں اپنی ناکامی کے لئے کوئی عذر پیش نہیں کروں گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر میں اپنی منزل کو بخوبی طور پر اپنے سامنے رکھ سکتی تو میں کامیاب ہو جاتی۔ منزل کا تصور آپ کو برابر آگے کے لئے متحرک رکھتا ہے:

> I'm not offering excuses, but I think I could have made it if I had been able to see my goal. Goal gives you a vision that keeps you pressing on.

یہ صرف تیراکی کی بات نہیں۔ یہی بات زندگی کے تمام معاملات کے لئے درست ہے۔ زندگی کا سفر ایک غیر ہموار سفر ہے۔ جب آدمی کے سامنے ایک واضح مقصد ہو تو وہ ساری ناخوش گواریوں کو انگیز کرتے ہوئے بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور جو آدمی واضح نشانہ سے محروم ہو وہ کسی بھی مقام پر تھک کر بیٹھ جائے گا، وہ زیادہ آگے تک نہیں جا سکتا۔

# یہ قیادت

پانچویں صدی عیسوی میں یونان میں کچھ ایسے سیاسی لیڈر ابھرے جنہوں نے لوگوں کے وقتی اور سطحی جذبات کو بھڑکا کر عوامی مقبولیت حاصل کی۔ ایسے کسی لیڈر کو اس زمانہ میں ڈیماگاگ (Demagogue) کہا گیا۔ ان میں سے ایک مشہور نام کلیون (Cleon) کا ہے۔ وہ ایک بلند آواز آدمی تھا۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر اس بات کی خصوصی صلاحیت تھی کہ وہ عوام پسند زبان میں کلام کر سکے۔ اس نے وقت کے نظام حکومت کے خلاف پر جوش تقریریں کر کے عوام کے اندر مقبولیت حاصل کر لی۔ (8/357)

موجودہ زمانہ میں ڈیماگاگ کا لفظ اس سیاسی لیڈر کے لئے بولا جاتا ہے جو لوگوں کے جذبات اور تعصبات کو مخاطب کرے اور اس طرح ان کے درمیان لیڈری اور مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ عوامی خواہشات کا نمائندہ بن کر عوام کی بھیڑ اپنے گرد اکٹھا کر لے (111/454-55) ویبسٹر کی ڈکشنری میں ڈیماگاگ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔ ایک شخص جو عوام کے جذبات اور ان کے تعصبات وغیرہ کو بھڑکائے اور اس طرح ان کا لیڈر بن کر اپنے ذاتی مفادات کو پورا کرے:

A person who tries to stir up the people by appeals to emotion, prejudice, etc., in order to become a leader and achieve selfish ends.

قیادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قائد وہ ہے جو عوام کے پیچھے چلے۔ جو عوامی جذبات کی ترجمانی کرے۔ دوسرا قائد وہ ہے جو عوام کو خود اپنے پیچھے چلائے، جو اصولوں کی نمائندگی کرنے والا ہو۔ پہلے قسم کے قائد کو موجودہ زمانہ میں ڈیماگاگ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے قائد کو ہمیشہ زبردست مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ ایسا قائد عوام کو اپنا وکیل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے گرد بہت جلد عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس معاملہ دوسری قسم کی قیادت کا ہے۔ ایسا قائد اپنے اعلیٰ ترین اوصاف کے باوجود عوام کے اندر اجنبی بن جاتا ہے۔ اس کے گرد لوگوں کی بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے نہیں چلتا بلکہ وہ برتر اصولوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ ایسے قائد کو اکثر یہ کام کرنا پڑتا ہے کہ وہ بولنے والوں کو چپ کرائے اور چلنے والوں کو روکے۔

# اعتراف

امریکی میگزین نیوز ویک (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) کے صفحہ ۵۰ پر ایک فرانسیسی خاتون گروٹ (Groult) کی کتاب پر تبصرہ ہے۔ اس میں کتاب کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ فرانس میں تحریک نسواں (Feminism) مایوسی کے دور سے گزر رہی ہے۔ مثلاً کتابوں کے ناشرین نے تحریک نسواں کے متعلق لٹریچر چھاپنا بند کر دیا ہے، کیوں کہ اس کے فروخت میں بہت کمی آگئی ہے۔

Publishers have stopped printing
feminist literature because of poor sales.

فرانس میں تحریک نسواں کی مشہور خاتون لیڈر بیور (Simone de Beauvoir) چار سال پہلے مر گئیں۔ ان کے بعد کوئی خاتون لیڈر ابھر نہ سکی۔ فرانس کی تحریک نسواں کو زندہ رکھنے کے لئے ایک لیڈر کی تلاش ہے۔ ایک فرانسیسی خاتون نے اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک کی عورتیں ممکن ہے کہ ایک غالب شوہر سے دور بھاگ سکی ہوں گی، مگر آخری چیز جو وہ چاہتی ہیں وہ دوسرا غالب ہے:

They may have escaped from a domineering husband
and the last thing they want is another dominator.

مرد کو اللہ تعالیٰ نے فعال صفات کے ساتھ پیدا کیا ہے اور عورت کو منفعل صفات کے ساتھ۔ دونوں صنفوں کے لئے فریضۂ حیات کے اعتبار سے یہی فطری تقسیم ہے۔ مغرب میں اس تعلیم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آخر کار فطرت غالب آئی۔ انسان کے خود ساختہ نظریات بے حقیقت ہو کر رہ گئے۔

تجربہ نے اور علمی تحقیقات نے ثابت کیا کہ اسلام کا نظریہ صحیح تھا اور مغرب کا نظریہ غلط۔ یہ فطرت کی سطح پر خدائی دین کی تصدیق اور غیر خدائی نظاموں کی تردید ہے۔ اس کے بعد انسان کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ خدا کے دین کا اعتراف کرتے ہوئے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

# استعداد کا مسئلہ

اردن سے ایک عربی میگزین "الاجنحة" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ مارچ ۱۹۹۰ (صفحہ ۵۸) میں ایک عرب خاتون لیما نبیل کا ایک مضمون دیکھا۔ اس کا عنوان تھا: غرناطة۔۔۔ الفردوس المفقود۔ (غرناطہ، فردوس گمشدہ)

موصوفہ سیاح کے طور پر غرناطہ گئیں۔ وہاں انہوں نے عرب عہد کے آثار کو دیکھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ غرناطہ میں میں نے عرب تاریخ کو اپنے سامنے پایا اور اپنے ماضی کی عظمت کا مشاہدہ کیا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر وہ رو پڑیں۔ وہ وہاں کے ایک ایک پتھر سے پوچھتی رہیں کہ یہاں عرب کی عظمت تھی اور یہیں سے پانچ سو سال پہلے عرب کی ذلت شروع ہوئی (هنا كان المجد العربي وهنا ايضا بدأالذل العربي قبل خمسمائة عام)"۔

وہ جذباتی انداز میں لکھتی ہیں کہ عربوں نے یہاں اپنے قلعوں اور محلوں اور مسجدوں کو چھوڑ دیا" وہ اس شہر سے عورتوں کی طرح روتے ہوئے نکلے۔ وہ مردوں کی طرح اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ (تركوا قلاعهم و قصورهم و مساجدهم . خرجوا من هذه المدينة يبكون مثل النساء. ملكا لم يحافظوا عليه مثل الرجال. وخرجتُ من غرناطة اطأطئ راسي و اسأل نفسي . الى متى سيستمر هذا الليل العربي. وماذا سيكتب التاريخ هنا)

عرب خاتون نے اپنے اس تاثراتی جملہ میں غرناطہ کے آخری سلطان کی ماں کے قول کو دہرایا ہے۔ مگر یہ سادہ معنوں میں مرد اور عورت کا مسئلہ نہیں۔ یہ قومی استعداد کا مسئلہ ہے۔ ۱۷۹۹ میں ٹیپو مرد کی جنگ لڑے مگر وہ ہار گئے۔ ۱۹۷۱ میں اندرا گاندھی ایک عورت تھی مگر وہ پاکستان کے مقابلہ میں جیت گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرد اور عورت کا معاملہ نہیں۔ بلکہ قومی استعداد اور حالات کا معاملہ ہے۔ اگر حالات موافقت نہ کر رہے ہوں تو کوئی شخص خواہ کتنی ہی زیادہ بہادری کے ساتھ لڑے، وہ مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

# نقصان کی تلافی

ریاض سے ایک عربی ہفت روزہ "الدعوۃ" کے نام سے نکلتا ہے۔ یہ غالباً مسلم دنیا کا سب سے زیادہ کثیرالاشاعت میگزین ہے۔ اس کے شمارہ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ میں ایک مضمون چھپا۔ اس کا عنوان تھا:

اجيالنا المسلمة في الغرب هل نتركها نهبًا للضياع

یعنی مغربی ملکوں میں ہماری مسلم نسلیں، کیا ہم ان کو لٹ کر ضائع ہونے کے لئے چھوڑ دیں۔

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت مغربی دنیا میں تقریباً دس ملین مسلمان آباد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو روزگار کے لئے یا اور کسی مقصد سے وہاں جاکر مقیم ہو گئے ہیں۔ مضمون نگار (ڈاکٹر عبدالقادر طاش) نے ان مسلمانوں کے متعلق لکھا تھا کہ وہ مغرب میں ہمارے سفیر ہیں (هم سفراؤنا في الغرب)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ صحیح ترین لقب ہے جو مغرب میں مقیم مسلمانوں کو دیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ لوگ امکانی طور پر ہمارے سفیر ہیں۔ وہاں وہ ہماری نمائندگی کرنے کی بہترین پوزیشن میں ہیں۔

یہ دس ملین مہاجر مسلمان جو مغربی ملکوں میں جاکر آباد ہوئے ہیں، ان کی اکثریت تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے وہ سادہ معنوں میں صرف مہاجر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مسلم ملت کا بہترین حصہ ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ انہیں اپنی اس حیثیت کا شعور حاصل ہو جائے۔ اور وہ اس عظیم کردار کو ادا کرنے کے لئے مستعد ہو جائیں جو حالات نے ان کے لئے مقدر کیا ہے۔

دس ملین مسلمانوں کا مغربی ملکوں مین جاکر بسنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ گویا اس تاریخ کا نئی صورت میں اعادہ ہے جو اسلام کے دور اول میں پیش آئی تھی۔ دور اول کے مسلمان بہت بڑی تعداد میں تاجر کے روپ میں غیر مسلم ملکوں میں داخل ہوئے ظاہری طور پر ان کا یہ داخلہ تجارت کے لیے تھا مگر غیر مسلم معاشرہ میں ان کا وجود اپنے آپ اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گیا۔ ٹھیک اسی طرح موجودہ زمانہ کے مسلمان اگرچہ بظاہر اقتصادی اغراض کے تحت مغربی ملکوں میں گئے ہیں مگر اس طرح غیر مسلم سماج میں ان کی موجودگی دوبارہ اسلام کی اشاعت کا سبب بن سکتی ہے، بشرطیکہ ان کے اندر اسلامی دعوت کی اسپرٹ پیدا ہو جائے۔

# مذہبی احترام

دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب ہیں۔ چھوٹے مذہبوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اتحاد کی فضا کس طرح پیدا کی جائے۔ کوئی اگر یہ کہے کہ تمام مذاہب کا خاتمہ کر دیا جائے تو ایسا ہونا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ مذہب کا احساس خود انسانی فطرت میں پیوست ہے، اور جو چیز خود انسانی فطرت میں اپنی جڑیں رکھتی ہو اس کو کسی بھی حال میں ختم نہیں کیا جاسکتا۔

مذہبی ہم آہنگی کا دوسرا فارمولا یہ بتایا جاتا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ مگر یہ ایک غیر حقیقی فارمولا ہے۔ کیوں کہ سچائی ہمیشہ ایک ہوتی ہے، سچائی کئی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے یہ فارمولا بھی قابل عمل نہیں۔ مذہب کوئی رسمی چیز نہیں ہے، مذہب سچائی کا نمائندہ ہے۔ جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میں فلاں مذہب کو مانتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے سچائی کے بارے میں اپنی تلاش کا جواب پالیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں یقینی سچائی پر کھڑا ہوا ہوں۔ ایسی حالت میں تمام مذاہب کی سچائی کا نظریہ خود مذہب کی اصل حقیقت کی نفی ہے۔ وہ انسان سے اس یقین کو چھین لینے کے ہم معنیٰ ہے جس یقین کے اوپر وہ دنیا کے کارزار میں پُراعتماد طور پر کھڑا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں بھی وہی فارمولا قابل عمل ہے جو دوسرے معاملات میں بالفعل طور پر رائج ہے۔ یعنی ایک اصول کو برحق مانتے ہوئے دوسرے اصولوں کا احترام کرنا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر آدمی کو یہ اختیار دیا جائے کہ اپنے علم کے مطابق وہ جس مذہب کو برحق سمجھے اس کو اپنا مذہب بنائے۔ وہ اس کی سچائی پر یقین کرتے ہوئے اس کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ اسی کے ساتھ ہر آدمی کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ دوسرے مذہبوں کا پورا احترام کرے۔ وہ دوسرے مذہبوں کو کسی تفریق کے بغیر یکساں طور پر عزت کا مقام دے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب کا باہمی اعتراف (mutual recognition) مذہبی اتحاد کا قابل عمل فارمولا نہیں۔ مذہبی اتحاد کا واحد قابل عمل فارمولا باہمی احترام (mutual respect) ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ایک شخص ایک خاتون کو دل سے اپنی ماں سمجھتا ہے، اسی کے ساتھ وہ دوسری تمام خواتین کا پورا احترام کرتا ہے، بغیر اس کے کہ اس نے یہ اعلان کیا ہو کہ دوسری تمام خواتین بھی میری حقیقی مائیں ہیں۔

# ایمان بالغیب

ایمان کی ایک صورت یہ تھی کہ خدا ہمارے سامنے عیاناً موجود ہوتا۔ فرشتے ادھر سے ادھر چلتے ہوئے نظر آتے۔ جنت اور جہنم کے مقامات کو دیکھنا اسی طرح ممکن ہوتا جس طرح کوئی شخص دنیا کے شہروں میں داخل ہو کر اس کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

اگر ایسا ہوتا تو یقیناً دنیا میں کوئی انکار کرنے والا نہ ہوتا۔ مگر اس کے بعد وہ ربانی شخصیت نہ بنتی جس کو آدمی کے اندر بنانا مقصود ہے۔ لوگ خدائی حقیقتوں کو بس دیکھی ہوئی حقیقت کے طور پر جان لیتے، مگر وہ اس کو خود دریافت کردہ حقیقت کے طور پر نہ پاتے۔ جب کہ خود دریافت کردہ حقیقت کہیں زیادہ بڑی اور گہری ہے، اور وہی مومن سے مطلوب ہے۔

دیکھی ہوئی حقیقت کو جاننا آدمی کے وجود کو زیادہ گہرائی کے ساتھ متاثر نہیں کرتا۔ وہ اوپری علم بن کر رہ جاتا ہے۔ مگر جب آدمی ایک چیز کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے، وہ اس کو جاننے کی کوشش میں اپنے دل ودماغ کی تمام قوتوں کو لگاتا ہے، اس کے بعد جب وہ چیز اسے ملتی ہے تو وہ اس کی پوری ہستی کو جگا دیتی ہے۔ وہ اس کی محبوب ترین چیز بن جاتی ہے۔

جو شخص مومن بالغیب ہو، وہ دنیا میں اِسی اعلیٰ ترین لیاقت کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ ایسا شخص تھا جو غیر متعلق باتوں میں نہیں الجھا۔ اس نے حقیقت کا اعتراف کیا، اس نے جبر کے بغیر خود اپنے اختیار سے ایک امر واقعہ کو تسلیم کیا۔

نرم زمین پر پانی برستا ہے تو بوند بوند اس کے اندر جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی فرق پہلے شخص اور دوسرے شخص کے درمیان ہے۔ مومن کے لئے ہدایت ملنا گویا نرم زمین پر خدا کا مینھ برسنا ہے، اور غیر مومن تک ہدایت کی آواز پہنچنا ایسا ہے جیسے سخت پتھر پر پانی ڈالنا۔

# ذمہ داری پر نظر

خلافت فاروقی کے زمانہ میں خالد بن ولید کا شامی افواج کی سپہ سالاری سے ہٹایا جانا اور ان کی جگہ ابو عبیدہ بن الجراح کو سپہ سالار مقرر کرنا، اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ خلیفہ ثانی کا یہ حکم پہنچا تو خالد بن ولید کی قیادت میں رومیوں سے جنگ ہو رہی تھی اور ابو عبیدہ بن الجراح ان کی ماتحتی میں لڑ رہے تھے۔ طویل جنگ کے بعد صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ عنقریب مسلمانوں کی فتح ہونے والی ہے:

**فاخفى ابو عبيدة الخبر وصار فى مكانه خلف خالد حتى ظهرت مقدمات النصر. وقد سئل عن عدم اخذه بلواء القيادة على الفور فقال: ماسلطان الدنيا اريد و ما للدنيا اعمل.**

پس ابو عبیدہ نے خبر کو چھپایا اور خالد کی ماتحتی میں بدستور لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ مقدمات فتح ظاہر ہو گئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ قیادت کا جھنڈا آپ نے فوراً کیوں نہ لے لیا تو انھوں نے جواب دیا: دنیا کی بڑائی میں نہیں چاہتا اور نہ میں دنیا کے لئے عمل کرتا ہوں۔

یہ تاریخ کا وہ واقعہ ہے جب کہ ایک جنرل ایک ملتے ہوئے فوجی کریڈٹ کو بالقصد چھوڑ دے اور اسے دوسرے کے حصہ میں جانے دے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ ابو عبیدہ کو دنیا میں اپنی عزت و شہرت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخروئی کا زیادہ خیال تھا۔ انھیں دکھائی دے رہا تھا کہ دنیا کے لحاظ سے کامیابی یہ ہے کہ خبر کا فوراً اعلان کیا جائے۔ اس کے برعکس آخرت کے لحاظ سے کامیابی یہ ہے کہ خبر کو چھپایا جائے۔ ذمہ داری کے خیال نے حقوق کو ان کی نظر میں بے حقیقت بنا دیا۔ وہ افسر کی حیثیت میں ہوتے ہوئے ماتحت بن کر لڑتے رہے اور بالقصد اس کو گوارا کر لیا کہ جنگ کی فتح کا سہرا ان کے ایک ماتحت فوجی کو حاصل ہو جائے۔

دوسری طرف اسی واقعہ میں خالد بن ولید کے کردار کو دیکھئے۔ یرموک کی فتح کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ نہ صرف اس عظیم جنگ بلکہ پچھلے بے شمار معرکوں کا فاتح معزول کر دیا گیا ہے، تو ان کے اندر سخت بے چینی پیدا ہو گئی۔ بہت سے فوجی اور غیر فوجی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انھوں نے

ہوگئے۔ انھوں نے حضرت خالد کی بہادری اور ان کی اسلامی خدمات کے بارہ میں پرجوش تقریریں کیں اور ان کی معزولی پر اپنی زبردست ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان کو ابھارا کہ وہ خلیفہ کا حکم ماننے سے انکار کردیں اور وعدہ کیا کہ ہم سب لوگ آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ (یحرضونہ علی عصیان امر الخلیفة ویعدونہ بانھم سیکونون معہ) مگر خالد بن ولید نے اس قسم کے مشورہ کو ماننے سے قطعاً انکار کردیا۔ وہ بخوشی اس پر راضی ہوگئے کہ اپنے ایک جونیر افسر عبیدہ بن الجراح کو سردار مان لیں اور ان کی ماتحتی میں ایک معمولی فوجی کی حیثیت سے اسلام دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرتے رہیں۔ اس وقت انھوں نے جو جملہ کہا، وہ تاریخ نے ان لفظوں میں محفوظ رکھا ہے: انا لا اقاتل فی سبیل عمرؓ ولکن فی سبیل رب عمر (میں عمر کی راہ میں جنگ نہیں کرتا بلکہ عمر کے رب کی راہ میں جنگ کرتا ہوں)۔

خالد بن ولید کو اس بلند کرداری پر جس چیز نے ابھارا وہ دراصل ایمانی نفسیات تھی جس کی نظر ہمیشہ حقوق کے بجائے ذمہ داریوں پر ہوتی ہے۔ اس واقعہ میں بظاہر ان کا ایک مسلّمہ حق پامال ہورہا تھا، مگر اللہ کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داری ان کے ذہن پر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ حق کی ظاہری پامالی انھیں بھول گئی اور ذمہ داری کے احساس کے سوا کوئی چیز انھیں یاد نہ رہی۔

جب آدمی کا یہ حال ہو کہ حقوق کے مقابلہ میں اس کی نظر ذمہ داریوں پر ہو تو اسی طرح ہر مسئلہ میں وہ اپنی ذات کو الگ کرکے معاملہ کرتا ہے۔ وہ ایسی بلند سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں ذاتی وقار، فوری مصالح، گروہی تحفظات سب بے حقیقت ہوجاتے ہیں۔ صداقت کے سامنے آتے ہی وہ اس طرح لپک پڑتا ہے جیسے اس کے اور صداقت کے درمیان کوئی روک ہی نہ تھا۔

حقوق کے مقابلہ میں ذمہ داریوں پر نظر ہونا، یہی تمام اعلیٰ اخلاقیات کی جڑ ہے۔ یہ چیز آدمی کے اندر پیدا ہوجائے تو گویا اس کے اندر سارے اخلاقی اوصاف پیدا ہوگئے۔ انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی، ہر جگہ وہ کھرا ثابت ہوتا ہے، ہر امتحان میں وہ پورا اترتا ہے، ہر کٹھنائی اس کی شخصیت کو نیا جلا دینے والی ثابت ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت اندرونی تضاد سے خالی ہوتی ہے، اس لئے خارجی دنیا میں بھی اس سے کسی تضاد کا ظہور نہیں ہوتا۔

# حدیث قدسی

صحیح البخاری (کتاب المرضیٰ) میں ایک حدیث قدسی اس طرح آئی ہے: اذا ابتلیت عبدی بحبیبتیه فصبر عوّضته منهما الجنة، یرید عینیه (فتح الباری ۱۰/۱۲۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے کسی بندہ کو اس کی دو محبوب آنکھوں سے آزماؤں اور وہ اس پر صبر کرے تو میں ان دونوں کے بدلے اسے جنت دے دیتا ہوں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنکھ سے محرومی اور جنت کے حصول میں کوئی لازمی رشتہ ہے۔ آنکھ سے محرومی بذات خود جنت میں داخلہ کا سبب نہیں بن جاتی۔ اصل یہ ہے کہ اس محرومی پر سچا صبر کرنے والے کے اندر وہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کو جنت میں داخلہ کا مستحق بنادیں۔

ایک عالم کا واقعہ ہے۔ وہ دینی مطالعہ میں مشغول رہتے تھے اور کتابیں لکھ کر دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ مگر ادھیڑ عمر کو پہنچ کر ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ یہ ان کے لئے انتہائی سخت حادثہ تھا۔ مگر انھوں نے اس پر کامل صبر کر لیا۔ اس صبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ذہن مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے رخ پر چلنے کے بجائے مثبت رخ پر سوچنے میں مشغول ہو گیا۔

آخر کار ان کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی جس کے ذریعہ سے وہ اپنے آپ کو دوبارہ کار آمد بنا سکیں۔ انھوں نے اپنی کوششوں کو تحریر کے بجائے تقریر کی طرف موڑ دیا۔ ان کے حافظہ میں معلومات کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ یہ معلومات اب نئے انداز سے تقریر کی صورت میں ظاہر ہونے لگیں۔ بہت جلد وہ ایک کامیاب مقرر کی حیثیت سے عوام وخواص میں مقبول ہو گئے۔

ان کی باچشم تحریروں میں اگر معلومات دین کی خصوصیت ہوتی تھی، تو ان کی بے چشم تقریروں میں معلومات کے ساتھ پرسوز آواز کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح آنکھ کے حادثہ نے ان کے جنتی کردار کو بڑھا کر ان کے استحقاق جنت میں مزید اضافہ کر دیا۔ خدا کی نظر میں وہ پہلے سے زیادہ رحمت خداوندی کے مستحق قرار پائے۔

# طرز فکر کا مسئلہ

زمین پر جو لوگ چل پھر رہے ہیں ان کو قرآن میں دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ جن کی حیثیت مردہ انسان کی ہے۔ اور دوسرے وہ جن کو زندہ انسان کہا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، وہ اس سے نکلنے والا نہیں۔ (الانعام ۱۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک انسان وہ ہے جس کو ہدایت کی روشنی ملی ہوئی ہے۔ اس روشنی کی بنا پر اس کو صحیح اور غلط دونوں بالکل کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں صحیح کو لیتا ہے اور غلط کو چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کو ہدایت کی روشنی حاصل نہیں۔ وہ نہ صحیح کو دیکھ پاتا ہے اور نہ غلط کو۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی راہوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مر کر مزید شدید تر انجام کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ (الاسراء ۷۲)

جن لوگوں کا شاکلہ بگڑا ہوا ہو، قرآن کی رہنمائی ان کے ذہن کا جزء نہیں بنے گی۔ قرآن کسی مسئلہ سے نپٹنے کے لئے صبر و اعراض کا طریقہ بتائے گا مگر ایسے لوگوں کو وہ بزدلی دکھائی دے گا اور اس بنا پر وہ اس کو چھوڑ دیں گے۔ قرآن و سنت کبھی پیچھے ہٹنے کی رہنمائی دیں گے۔ مگر ایسے لوگ اس کو اختیار کرنے کی طرف راغب نہ ہوں گے کیوں کہ اس قسم کا حل انہیں اپنے وقار کے خلاف نظر آئے گا۔ کہیں قرآن کی تعلیم یہ ہوگی کہ تم دشمن کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اس کے ساتھ خیر خواہی سے پیش آؤ مگر وہ اس کو اختیار نہ کریں گے کیوں کہ ان کا نفرت و انتقام کا ذہن اس پر رکاوٹ بن جائے گا۔

قرآن کی ایک تعلیم سامنے آئے گی مگر ایسے لوگوں کا بگڑا ہوا شاکلہ واقعات کو قرآنی نظر سے نہ دیکھ سکے گا اس لئے وہ واقعات کا غلط تجزیہ کریں گے۔ اس بنا پر وہ قرآن کی تعلیم کی طرف راغب نہ ہو سکیں گے۔

# ذکر اللہ

قرآن میں ہے کہ زمین و آسمان میں خدا کی جو تخلیقی نشانیاں ہیں ان کو دیکھنا اہل ایمان کے لئے خدا کی یاد (ذکر) کا وسیلہ ہے (آل عمران)۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فضا میں ایک چڑیا اڑتی ہوئی دیکھتے تو اس سے بھی لوگوں کو خدا کی یاد دلاتے۔ دوسری طرف قرآن میں ہے کہ حضرت یونس جب مچھلی کے پیٹ میں تھے، جب وہ زمین و آسمان کی آیات (نشانیوں) کو براہ راست طور پر دیکھ نہیں سکتے تھے، انھوں نے اس وقت اللہ کی تسبیح کی اور اس کا ذکر کیا (الصفّٰت ۱۴۳)

یاد ہمیشہ کسی واسطہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مثلاً کبھی قطب مینار کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کی یاد آتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی "قطب مینار" کا لفظ اپنے ذہن میں دہراتا ہے اور اس سے قطب مینار کے صانع کی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ خدائی یاد (ذکر اللہ) کا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کائنات میں پھیلی ہوئی باکمال کارگیری کو دیکھتا ہے۔ یہ باکمال کارگیری اس کو خالق کی یاد دلاتی ہے۔ وہ اللہ کی یاد میں غرق ہو جاتا ہے۔

کبھی انسان پر وہ لمحہ آتا ہے جب کہ کائنات کی محسوس نشانیاں اسے دکھائی نہیں دیتیں۔ مثلاً وہ جیل کے کمرہ میں بند کر دیا جائے یا وہ آنکھوں سے معذور ہو گیا ہو۔ اس دوسری حالت میں وہ الفاظ کے واسطہ سے اپنا ربط خدا سے قائم کرتا ہے۔ وہ خدا کا نام لے کر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔

آدمی خلا کی حالت میں کسی چیز کا تصور قائم نہیں کرسکتا۔ قطب مینار کو یاد کرنے کے لئے یا تو اس کو دیکھنا ہوگا، یا "قطب مینار" کا لفظ اپنے ذہن میں لانا ہوگا مجرد انداز میں کسی کو یاد کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں۔

خدا کے ذکر (یاد) کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کی تخلیقات کو دیکھ کر اس کا تصور ذہن میں لایا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ذکر کے الفاظ کو زبان سے ادا کر کے خدا سے یاد والا تعلق قائم کیا جائے۔ دونوں ہی ذکر کی صورتیں ہیں۔ افضل ذکر کا تعلق اندرونی کیفیت سے ہے نہ کہ ذکر کی ظاہری صورت سے۔

# قابل عمل فارمولا

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ ہر مذہب اپنی اپنی جگہ پر سچا ہے۔ کوئی مذہب نہ زیادہ سچا ہے اور نہ کوئی مذہب کم سچا۔ انھوں نے کہا کہ یہی واحد مذہبی نظریہ ہے جس سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ نظریہ غیر فطری بھی ہے اور غیر عقلی بھی۔ دنیا کی کسی بھی چیز میں آدمی ایسا نہیں کرتا کہ بیک وقت ہر بات کو یکساں طور پر درست سمجھے۔ مثلاً کوئی بھی انسان نہیں کہتا کہ کہ زمین۔ مرکزی گردش کا نظریہ بھی صحیح اور آفتاب۔ مرکزی گردش کا نظریہ بھی صحیح۔ ہر آدمی ایک نظریہ کو صحیح اور دوسرے کو غلط بتاتا ہے۔ پھر مذہب ہی میں استثنائی طور پر ایسے ناقابل فہم نظریہ کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت۔

میں نے کہا کہ شہنشاہ اکبر نے حکومت کے زور پر یہ نظریہ چلانا چاہا مگر وہ نہیں چلا۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے ۳۰ سال کے گہرے مطالعہ کے بعد اپنی مشہور کتاب Essential Unity of all Religions لکھی۔ مگر یہ انسائیکلوپیڈیائی کتاب بھی اس نظریہ کو قائم نہ کر سکی۔ مہاتما گاندھی نے اپنی قائدانہ مقبولیت سے اس کو رواج دینا چاہا مگر وہ بھی ناکام ہو گئے۔ حتی کہ خود ان کا یہ حال ہوا کہ زندگی بھر وہ رام رحیم ایک ہے کہتے رہے مگر جب ان کو قتل کیا گیا تو ان کی زبان سے آخری الفاظ یہ نکلے "ہے رام" نہ کہ 'ہے رام ہے رحیم'۔

اس معاملہ میں زیادہ درست فارمولا وہ ہے جو قرآن میں دیا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لکم دینکم ولی دین (الکافرون) یعنی تمہارے لئے تمارا دین اور میرے لئے میرا دین۔ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کی دوسری تعلیمات کو ملا کر اس کا ایک فارمولا بنایا جائے تو وہ یہ ہوگا ـــــ ایک کی پیروی کرو اور سب کا احترام کرو:

Follow one and respect all

# عبرت پذیری

ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء (جلد ۱) میں محمد بن واسع سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص بصرہ سے سوار ہو کر امّ ذر کے پاس آیا جب کہ ان کے شوہر ابوذر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے ام ذر سے پوچھا کہ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے حضرت ابوذر کی عبادت کے بارہ میں بتائیں۔ صحابی کی اہلیہ ام ذر نے جواب دیا: وہ سارے دن اکیلے بیٹھے ہوئے سوچتے رہتے تھے (کان النہار اجمع خالیاً یتفکر) اسی طرح ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء (جلد ۱) میں عون بن عبد اللہ بن عقبہ سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے ام الدرداء سے پوچھا کہ حضرت ابوالدرداء کا سب سے افضل عمل کیا ہوتا تھا۔ ان کی اہلیہ نے جواب دیا: سوچنا اور عبرت پکڑنا (التفکر والاعتبار) سالم بن ابی جعد کہتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداء کے سامنے سے دو بیل گزرے۔ دونوں کو ان کے مالک نے کام پر لگا رکھا تھا۔ ایک بیل اپنے کام پر قائم رہا اور دوسرا رک گیا۔ حضرت ابوالدرداء نے یہ منظر دیکھ کر کہا: اس میں بھی عبرت ہے (ان فی ھذا لمعتبراً) یعنی رکنے والے نے مالک کا ڈنڈا کھایا اور دوسرے نے نہیں، یہی معاملہ انسان کے ساتھ اس کا خدا کرے گا۔

قرآن میں غور و فکر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ غور و فکر مومن کی مستقل صفت ہے۔ اسی سے آدمی کے اوپر معرفت خداوندی کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی سے اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی سے وہ اس درجۂ احسان تک پہنچتا ہے جس کے متعلق حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو (تعبد اللہ کانك تراہ)

قرآن میں اہل ایمان کی ایک صفت السائحون (زمین پر پھرنے والے) بتائی گئی ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ سیاحت کا لفظ قدیم زمانہ سے مذہبی سفر کے لئے بولا جاتا رہا ہے۔ لسان العرب میں اس کی تشریح کے ذیل میں یہ الفاظ آئے ہیں: الذھاب فی الارض للعبادۃ والترھب (عبادت اور دنیا سے بے تعلقی کے لئے زمین میں نکل جانا) مفردات امام راغب میں

ہے کہ ایک قول کے مطابق اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس آیت قرآنی کے تقاضوں پر چلیں۔
کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں جس سے ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ وہ اس سے سمجھتے
اور ان کے کان ایسے ہو جاتے جن سے وہ سنتے (قیل السائحون هم الذین یتحرّون ما اقتضاه
قوله: افلم یسیروا فی الارض فتکون لهم قلوب یعقلون بها او آذان یسمعون بها،
(الحج ۴۶) بعض مفسرین کے نزدیک السائحون سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی توحید اور اس کے
نظام تخلیق میں بہت زیادہ فکر کریں اور اللہ نے جو عبرت اور نشانیاں اپنی توحید اور عظمت کو بتانے
والی پیدا کی ہیں ان پر غور کریں (وقیل هم الجاهدون بافکار هم فی توحید ربهم و ملکوته
و ماخلق من العبر و العلامات الدالة علی توحیده و تعظیمه)

انسان کے بنائے ہوئے تمدن کے ماورا جو خدا کی دنیا ہے وہ خدا کی صفات کمال کا براہ راست مظہر ہے۔ یہاں مخلوقات میں اس کا خالق دکھائی دیتا ہے۔ اپنے اس تخلیقی کارخانہ میں خدا نے ایسی نشانیاں رکھ دی ہیں جو سوچنے والے کی آنکھیں کھول دیں۔ جو اس کے اندر ربانی شعور بیدار کریں، جو اس کو تڑپا کر اس کے رب سے ملا دینے کا سبب بن جائیں۔

آدمی کا عمل اس کی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ سوچ گہری ہو گی اتنا ہی زیادہ گہرا نتیجہ نکلے گا اور سوچ میں جتنی کمی ہو گی اتنا ہی عمل میں کمی ہو جائے گی۔

اسلام کی بنیاد شعور پر قائم ہے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے شعور کو زیادہ سے زیادہ بیدار کیا جائے۔ انسان کی فکری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔ انسانی دماغ کے سوئے ہوئے خانوں کو آخری حد تک متحرک کر دیا جائے۔

اسی شعوری بیداری پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ باشعور لوگ ہی اعلیٰ ایمان کا تجربہ کرتے ہیں۔ باشعور لوگوں کی عبادت ہی زندہ عبادت ہوتی ہے۔ باشعور لوگ ہی یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ ان کی زندگیاں ربانی کردار کا نمونہ بنیں۔ باشعور افراد کے مجموعہ کا نام ہی صالح معاشرہ ہے۔ باشعور افراد ہی یہ طاقت رکھتے ہیں کہ وہ اسلام کے اصولوں پر ایک حقیقی نظام بنائیں۔

# فطرت کی آواز

علاؤالدین خان صاحب (پیدائش ۱۹۶۶ء) میرپور کے رہنے والے ہیں۔ ۲۰ ستمبر ۲۰۰۰ کو دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر یہ مانتا ہوں کہ ہندستان میں دعوت کے مواقع بہت زیادہ ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان میل ملاپ کو بڑھایا جائے۔ اور مسلمانوں کے اندر دعوتی ذہن پیدا کیا جائے تاکہ وہ ملاقات کے مواقع کو دعوتی مقصد کے لئے استعمال کر سکیں۔

انہوں نے ایک ذاتی تجربہ بتایا۔ انہوں نے کہا کہ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میں سنگم ایکسپریس کے ذریعہ میرٹھ سے علیگڈھ جارہا تھا۔ اسٹیشن پر پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ جب میں پلیٹ فارم پر پہنچا تو گاڑی چل چکی تھی۔ میں ابھی گاڑی پر بیٹھ نہیں پایا تھا کہ اس کا پچھلا ڈبہ سامنے آگیا جو ریلوے گارڈ کا ڈبہ ہوتا ہے۔ گارڈ نے مجھ کو پلیٹ فارم پر دیکھ کر کہا کہ آیئے، اس ڈبہ میں بیٹھ جایئے۔ چنانچہ میں دوڑ کر گارڈ کے ڈبہ میں سوار ہوگیا۔

گارڈ صاحب کا نام رام کمار ورما تھا۔ وہ مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مجھے ڈبہ کے اندر بیٹھنے کی جگہ دی چنانچہ میں وہاں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے اپنا ٹفن کیریر نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا اس کے بعد مجھ سے کہا کہ آیئے کھانا کھایئے میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے کہا کہ کیا میں شراب پی سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ آپ کی مرضی۔ یہ کہہ کر میں نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور اس کو پڑھنے لگا۔

دوسری طرف گارڈ صاحب شراب پینے میں مشغول ہوگئے۔ اس ماحول سے مجھے وحشت سی ہوئی، خاص طور سے اس لیے کہ وہاں شراب کی تیز بو پھیل گئی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ اگلے اسٹیشن (ہاپوڑ) میں ٹرین سے اتر کر دوسرے ڈبہ میں سوار ہوجاؤں گا۔ گارڈ صاحب کو میرے

ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ آپ ایک دھارمک آدمی ہیں میں آپ کو اپنے ساتھ علیگڈھ تک لے چلوں گا۔ آپ درمیان میں نہیں اتر سکتے۔ تاہم میں وہاں ٹھہر نہ سکا اور ہاپوڑ ریلوے اسٹیشن پر اتر کر دوسرے ڈبہ میں چلا گیا۔ البتہ میں نے یہ کیا کہ اس وقت میرے بیگ میں اسلامی مرکز دہلی کی چھپی ہوئی کتاب 'انسان اپنے آپ کو پہچان' (ہندی) کا ایک نسخہ تھا، وہ میں نے گارڈ صاحب کو پڑھنے کے لئے دے دیا اور اتر کر دوسرے ڈبہ میں سوار ہو گیا۔

گھر واپس آنے کے بعد میں اس واقعہ کو تقریباً بھول چکا تھا مگر ڈیڑھ مہینہ بعد مذکورہ گارڈ کا ایک خط ملا۔ گارڈ صاحب کو میں نے جو کتاب دی تھی اس پر میرے پتہ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس پتہ کو دیکھ کر گارڈ صاحب نے میرے نام یہ خط بھیجا تھا۔ میری طرف سے جواب میں تاخیر ہوئی تو ان کا دوسرا خط آ گیا۔ انہوں نے اپنے خطوط میں یہ لکھا کہ آپ کی دی ہوئی کتاب میں نے کئی بار پڑھی۔ انہوں نے لکھا کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ اس نے میرے اندر نئی سوچ پیدا کر دی۔ اب میں اس قسم کی اور کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں۔ مسٹر رام کمار ورما (گارڈ) نے خط کے ذریعہ یہ خواہش ظاہر کی کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ طے شدہ وقت کے مطابق میرٹھ کے ریلوے اسٹیشن کے گیسٹ ہاؤس میں ان سے ملاقات ہوئی انہوں نے بتایا کہ آپ کی دی ہوئی کتاب کو پڑھنے کے بعد میرے اندر اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ میں ہندی میں اسلامی کتابیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس مطالعہ کے بعد میرے اندر بہت سی فکری و عملی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ پہلے میں شراب کا سخت عادی تھا۔ مگر اب میں شراب کو بالکل چھوڑ چکا ہوں۔

اس واقعہ کو جب میں نے سنا تو میں نے کہا کہ یہ مسٹر گارڈ کا واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ مسٹر نیچر کا واقعہ ہے۔ ہر آدمی جو اس دنیا میں پیدا ہوا ہے وہ مسٹر نیچر ہی ہے۔ دعوت کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی اپنی اس حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہر آدمی دینِ فطرت کو اس طرح قبول کر لے گا جیسے کہ وہ اس کی اپنی ہی بھولی ہوئی چیز ہو۔

# ایک واقعہ دو انجام

دہلی کے اوکھلا و یہار کے علاقہ میں ایک تقریری پروگرام کے تحت جانا ہوا۔ نظام الدین سے اوکھلا و یہار تک کے اس سفر میں مندرجہ ذیل افراد میرے ساتھ تھے: برادرم محمد خالد ندوی، مسجد کے امام قاری محمد سمیع اللہ صاحب، اور واحد علی انجینئر صاحب Tel. 6922073۔

۱۰ جون ۱۹۹۸ کی شام کو اس مسجد میں پہنچا جس کو عام طور پر جسولا و یہار کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ اس کے بارے میں مجھے کوئی واقفیت تھی۔ عشاء کے وقت جب میں وہاں پہنچا تو یہ میرے لئے ایک غیر متوقع منظر تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ مسجد جس کا نام اقراء مسجد ہے کسی آبادی میں نہیں ہے بلکہ وہ ایک کھلی ہوئی جگہ پر ہے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ یہاں مسجد کے چاروں طرف مسلمانوں کی ایک بڑی کالونی تھی اس کالونی کے اندر انہوں نے یہ مسجد بنائی تھی۔ مگر یہ کالونی غیر قانونی تھی اور دلی کے ماسٹر پلان کے خلاف بنائی گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۸۹ میں راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں اس قسم کی دوسری بہت سی کالونیوں کی طرح اس کو بھی مکمل طور پر توڑ دیا گیا۔ D.D.A. کے عملہ نے بلڈوزر کے ذریعہ مسلمانوں کے ہزاروں مکانوں کو ڈھادیا۔

آخر میں مسجد کی باری تھی مگر یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ D.D.A. کا ایک ملازم جس کا نام پنڈت شرما تھا وہ بلڈوزر کا آپریٹر تھا۔ اس نے مسجد کو بلڈوز کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے افسر نے سختی کے ساتھ حکم دیا مگر وہ راضی نہیں ہوا، افسر نے دھمکی دی کہ میں تم کو ملازمت سے برخواست کر دوں گا۔ پنڈت شرما نے کہا کہ آپ جو چاہیں کریں، مگر میں مسجد پر اپنا بلڈوزر نہیں چلا سکتا۔ چنانچہ پوری کالونی مکمل طور پر ڈھادی گئی۔ مگر یہ مسجد اکیلی عمارت کی حیثیت سے کھڑی رہی۔ ایک عرصہ تک یہ مسجد غیر آباد پڑی ہوئی تھی۔ اب قاری محمد سمیع اللہ صاحب نے اس کو آباد کیا ہے۔ انہوں نے اس کی نئی تعمیر کر کے وہاں ایک مدرسہ بھی قائم کر دیا

ہے جس کا نام مدرستہ الحراء ہے۔

ایک طرف جسولا ویہار کی یہ مسجد ہے جس کو توڑنے سے ہندو انکار کر دیتا ہے، دوسری طرف ایودھیا کی مسجد ہے جس کو ہندو اقدام کر کے توڑ ڈالتا ہے۔ یہ فرق کیوں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جسولا ویہار کا ہندو ایک نارمل ہندو تھا۔ جب کہ ایودھیا کا ہندو ایک غیر نارمل ہندو تھا جس کی انا کو نااہل مسلم لیڈروں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے بھڑکا دیا تھا۔ گویا کہ جسولا ویہار کا ہندو اگر مسٹر ہندو تھا تو ایودھیا کا ہندو مسٹر ایگو تھا۔ سیکڑوں سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسٹر ہندو نے کبھی کسی مسجد کو نہیں توڑا مگر جب مسٹر ہندو کو بھڑکا کر مسٹر ایگو بنا دیا جائے تو اس کے بعد وہ ہوگا جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ایودھیا میں پیش آیا۔

اجتماعی زندگی میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ آپ دوسروں کے ایگو (انا) کو نہ بھڑکائیں۔ جس انسان کا ایگو بھڑکایا نہ گیا ہو وہ اپنی ضمیر کے تابع ہوتا ہے اور جس انسان کا ایگو بھڑکا دیا جائے وہ اپنی نفس امارہ کے تابع بن جاتا ہے اور جو انسان اپنی نفس امارہ کے تابع بن جائے وہ گویا ایک حیوان ہے، اگرچہ بظاہر وہ ایک انسان دکھائی دیتا ہو۔

مذکورہ واقعہ گویا اس آیت کی تفسیر ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے "وإن تصبروا و تتقوا لا يضركم كيدهم شيئاً إن الله بما يعملون محيط" (آل عمران ۱۲۰)۔

اس آیت کے مطابق، اس دنیا میں اصل مسئلہ کید (سازش) کی موجودگی نہیں ہے، بلکہ صبر کی غیر موجودگی ہے۔ اہل ایمان اگر صبر کی روش اختیار کریں تو ان کے لئے خدا کی ضمانت ہے کہ ان کے خلاف سازش کرنے والوں کی سازش یقینی طور پر بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ البتہ اگر اہل ایمان بے صبری کی روش اختیار کریں تو سخت اندیشہ ہے کہ وہ اغیار کی سازش کی زد میں آجائیں۔

مذکورہ دونوں مثالیں اس کا کھلا ہوا نمونہ ہیں۔ ایودھیا کی مسجد کے معاملہ میں جذباتی

لیڈروں کی رہنمائی میں مسلمانوں نے غیر صابرانہ روش اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایودھیا کی مسجد کو کچھ مشتعل ہندوؤں نے توڑ دیا۔ اس کے برعکس، دہلی کی مسجد کے معاملہ میں کوئی جذباتی لیڈر اشتعال دلانے کے لئے موجود نہ تھا۔ یہاں فطرت نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ چنانچہ انہوں نے صبر اور خاموشی کی روش اختیار کرلی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کی مسجد جہاں تھی وہیں بدستور قائم رہی، بلکہ سرکاری حکم کے باوجود ہندو نے اس کو توڑنے سے انکار کردیا۔

جسولا ویہار کی مسجد اور ایودھیا کی مسجد کا تقابل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دونوں کُلّی طور پر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ تمثیل یا تقابل کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ دونوں کے درمیان کلی یکسانیت پائی جائے۔ تمثیل یا تقابل ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان جزئی مشابہت کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ کلی مشابہت کے اعتبار سے۔

اسی طرح یہاں جسولا ویہار کی مسجد اور ایودھیا کی مسجد کے درمیان جو تقابل کیا گیا ہے وہ صرف ایک پہلو کے اعتبار سے ہے، اور وہ یہ ہے کہ دونوں مسجدوں کا معاملہ یکساں طور پر ہندو کے ساتھ پیش آتا ہے، مگر ایک ہندو مسجد کو توڑ ڈالتا ہے اور دوسرا ہندو مسجد کو نہیں توڑتا۔

زندگی کے معاملات کو سمجھنے کے لئے تقابل (comparison) کا طریقہ نہایت اہم ہے۔ اس تقابل ہی سے زندگی کی زیادہ گہری حقیقتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ بشرطیکہ تقابلی مطالعہ کرنے والا آدمی کھلے ذہن کے ساتھ یہ مطالعہ کرے۔ اور مطالعہ کا جو نتیجہ نکلے اس کو وہ بلا بحث مان لے، خواہ یہ نتیجہ اس کے خلاف ہو، اور خواہ یہ نتیجہ اس کے پورے نظریاتی ڈھانچہ کو ڈھا دینے والا ہو۔

کوئی آدمی جب ایک سچائی کا انکار کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک خارجی چیز کا انکار کررہا ہوں، حالانکہ وہ خود اپنا انکار کررہا ہوتا ہے، اگرچہ وہ اپنی نادانی کی بنا پر اس کو نہیں جانتا۔

## سوال

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الانبیاء نہیں تسلیم کرتے۔ اس کی کیا حقیقت ہے براہ کرم واضح فرمائیں۔ (سید احسن الدین، مراد آباد)

## جواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انسانوں، بشمول انبیاء علیہم السلام پر، افضل و اعظم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار سرے سے ممکن ہی نہیں۔ صاحب ایمان تو درکنار، غیر مسلم بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریز مورخ ٹامس کارلائل (وفات ۱۸۸۱) نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام پیغمبروں کا ہیرو بتایا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے ایک اسکالر ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے آپ کو تمام انسانوں میں سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے، وغیرہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل ہونا بجائے خود ایک مسلم واقعہ ہے۔ یہاں اصل سوال خود اس واقعہ کا نہیں بلکہ اس کی تعبیر کا ہے۔ یعنی اس حقیقت کی منصوص تعبیر کیا ہے۔ اور اس کے اظہار کا منصوص طریقہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک تسلیم شدہ واقعہ ہے کہ ہر مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی گہرا قلبی تعلق ہونا چاہئے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، اس قلبی کیفیت کی منصوص تعبیر محبت رسول ہے، عشق رسول اس کی منصوص تعبیر نہیں۔

تعبیر کا یہی فرق مذکورہ مسئلہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ''افضل الانبیاء'' کی تعبیر قرآن یا حدیث میں اختیار نہیں کی گئی۔ مثلاً قرآن میں (محمد) رسول اللہ و خاتم النبیین تو ہے مگر قرآن میں کہیں بھی محمد افضل الانبیاء جیسی کوئی آیت نہیں۔ اسی طرح حدیث میں انا الماحی تو ہے مگر حدیث میں کہیں بھی انا افضل الانبیاء جیسا کوئی کلمہ نہیں۔

تعبیر کا یہ فرق ایک بے حد اہم حکمت پر مبنی ہے۔ یہ حکمت کیا ہے، وہ ایک حدیث سے

واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مدینہ کے ایک مسلمان اور مدینہ کے ایک یہودی کے درمیان تکرار ہوئی۔ یہودی نے قسم کھا کر کہا کہ اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام دنیا والوں پر فضیلت دی۔ یہ سن کر مسلمان نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور یہودی کے چہرہ پر طمانچہ مارا اور کہا کہ اے خبیثؒ، کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر بھی۔ اس کے بعد یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور مسلمان کے خلاف شکایت کی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا تفضلونی علی الانبیاء** (تفسیر ابن کثیر ۱/ ۳۰۴) یعنی مجھ کو دوسرے نبیوں پر فضیلت نہ دو۔ اس مفہوم کی اور بھی کئی روایتیں ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا تفضلوا بین الانبیاء** (صفحہ ۳۰۴) یعنی نبیوں کے درمیان ایک دوسرے کو افضل نہ بتاؤ۔

مذکورہ روایت بتاتی ہے کہ افضل الانبیاء کی تعبیر شریعت میں کیوں اختیار نہیں کی گئی۔ مسلمان اور یہودی کے مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل الانبیاء کی تعبیر، بطور واقعہ درست ہونے کے باوجود، لوگوں کے اندر فخر وناز کی نفسیات پیدا کرتی ہے۔ ہر ایک اپنے فخر کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر ضروری قسم کے نزاعات ابھرتے ہیں۔

ایک گروہ دوسرے گروہ پر اپنی برتری ثابت کرنے میں لگ جاتا ہے، جب کہ زیادہ صحیح اور مفید بات یہ ہے کہ خدا کا اصل دین لوگوں کے درمیان زیر بحث آئے۔ داعی اور مدعو کے درمیان دعوت کے موضوع پر ڈائلاگ ہو نہ کہ دونوں ایک دوسرے پر اپنی برتری ثابت کرنے میں مصروف ہو جائیں۔

اس معاملہ میں قرآن وحدیث سے جو منصوص تعبیر ملتی ہے اس کا فائدہ یہی ہے۔ مثلاً قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین (الاحزاب ۴۰) کہا گیا ہے۔ یہ تعبیر اہل ایمان کے اندر ذمہ داری کا جذبہ ابھارتی ہے۔ اس سے یہ احساس بیدار ہوتا ہے کہ پیغمبر کے بعد اب پیغمبر کے ماننے والوں کو یہ کام کرنا ہے کہ آپ کے لائے ہوئے دین کی ہر زمانہ اور ہر نسل میں اشاعت کرتے رہیں۔ وہ ختم نبوت کے بعد پیغام نبوت کا تسلسل دنیا میں جاری رکھیں۔ یہ

تعبیر بتاتی ہے کہ ختم نبوت کے بعد آپ کی امت مسئولیت کے اعتبار سے مقام نبوت پر ہے۔ پہلی تعبیر اگر فخر کا احساس پیدا کرتی ہے تو دوسری تعبیر ذمہ داری کا احساس ابھارتی ہے۔

اسی طرح حدیث کی یہ تعبیر کہ ''انا الماحی الذی یمحو بیَ اللہ الکفر (البخاری، کتاب المناقب) یعنی میں مٹانے والا ہوں، اللہ میرے ذریعہ سے کفر کو مٹائے گا۔ اُس تعبیر سے دوبارہ ذمہ داری کا گہرا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس میں اہل ایمان کو یہ پیغام ملتا ہے کہ ہر دور میں جو باطل نظریہ ابھرے، ہر دور میں دین حق کے خلاف جو شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں ان کے مقابلہ میں وہ بھرپور طور پر کھڑے ہوں اور ہر فکری اور نظریاتی محاذ پر اٹھنے والے طوفانوں کو پیچھے دھکیل دیں۔ یہ وہی فکری جہاد ہے جس کو قرآن میں جہاد کبیر کہا گیا ہے (الفرقان ۵۲)

تعبیر کی اہمیت نفسیاتی اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ مثلاً پیغمبر کے ساتھ قلبی تعلق کے بارے میں عشق رسول کی غیر منصوص تعبیر خوش عقیدگی کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں محبت رسول کی منصوص تعبیر اطاعت رسول کا جذبہ ابھارتی ہے۔ اسی طرح افضل الانبیاء کی غیر منصوص تعبیر فخر کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن وحدیث کی مذکورہ منصوص تعبیر دعوت اور عمل کا جذبہ ابھارتی ہے۔

سوال

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ نے اجودھیا کی بابری مسجد کے مسئلہ کا یہ حل پیش کیا کہ بابری مسجد کو ہندوؤں کے حوالہ کر دیا جائے۔ کیا کوئی مسجد کسی کے حوالہ کی جاسکتی ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔ (سید اکرام الدین، حیدر آباد)

جواب

مسجد ابدی طور پر مسجد ہے۔ مسجد حکماً اللہ کی ملکیت ہے نہ کہ مسلمانوں کی ملکیت۔ اس لئے مسجد کو کسی بھی مسلم یا غیر مسلم کے حوالے نہیں کیا جاسکتا کسی بھی شخص کو اس قسم کا حق حاصل نہیں۔ میرے بارے میں جو لوگ مذکورہ قسم کی بات کہتے ہیں، وہ میرے اوپر ایک بے بنیاد الزام

لگاتے ہیں۔ کیوں کہ میں نے نہ کبھی ایسا کہا اور نہ کبھی ایسا لکھا، میری کسی بھی تحریر سے اس کا ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔

اس معاملہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے عقلِ عام "کامن سنس" ہی کافی ہے۔ اس معاملہ میں کامن سنس کو استعمال کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ میں ہر گز ایسا نہیں کہہ سکتا۔ جب مسجد اللہ کی ملکیت ہے، وہ کسی انسان کی ملکیت نہیں، ایسی حالت میں اگر میں ایسا کہوں کہ مسلمان بابری مسجد کو ہندوؤں کے حوالہ کر دیں تو یہ میرے لئے خود اپنی حیثیت عرفی (reputation) کی نفی کے ہم معنیٰ ہوگا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں مسجد کے معاملہ میں شرعی حکم کو نہیں جانتا اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی حیثیت عرفی کی نفی کا تحمل نہیں کر سکتا، پھر میں کیوں کر ایسا کروں گا۔

میں اللہ کے فضل و توفیق سے تقریباً سے پچاس سال سے قرآن و حدیث کی خدمت کر رہا ہوں۔ میرے اس کام کی اہمیت اسی لئے ہے کہ لوگ مجھ کو ایک عالم دین سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں میں خود اپنے ساتھ دشمنی کروں گا اگر میں مسجد کے بارے میں مذکورہ قسم کا بیان دوں۔ کیوں کہ اس کے بعد لوگوں کی نظر میں میرا عالم دین ہونا مشتبہ ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ میرا پورا دینی مشن بھی۔ اتنے نازک معاملہ میں میں اتنی بڑی نادانی کیسے کر سکتا ہوں۔

بابری مسجد کے معاملہ میں میری رائے اول دن سے اور اب تک ایک ہی رہی ہے۔ اس کی تفصیل الرسالہ کے شماروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ الرسالہ کے یہ مضامین یکجائی طور پر ایک کتاب میں شائع کئے جاچکے ہیں جس کا نام قیادت نامہ ہے۔ تفصیل کے طالب اس کتاب کو دیکھ سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ۱۹۹۲ء کے حادثہ سے پہلے اور حادثہ کے بعد ہر مرحلہ میں میں ایک ہی بات کہتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ جمہوریت کے ماحول میں جب بھی کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو تو اس کو ہمیشہ پر امن دائرہ میں حل کرنا چاہئے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ۱۹۹۲ء سے پہلے کچھ خود ساختہ مسلم لیڈر

مسجد کی تحریک کو سڑک پر لے آئے۔ انہوں نے ایک مقامی مسئلہ کو آل انڈیا مسئلہ بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دھمکی کی زبان استعمال کرنا شروع کیا، مثلاً وہ کہتے تھے کہ بابری مسجد کو چھو کر تو دیکھو۔ اسی طرح انہوں نے اعلان کیا کہ سارے ہندستان کے مسلمان مارچ کر کے اجودھیا میں داخل ہو جائیں گے۔ اور یہ کہ اگر بابری مسجد ٹوٹی تو سارا ملک ٹوٹ جائے گا، وغیرہ۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے کہا تھا کہ جلسہ جلوس کی سیاست گرمی زیادہ پیدا کرتی ہے اور روشنی کم۔ یہی میرا کہنا تھا۔ اس معاملہ میں بقیہ علماء اور رہنماؤں سے میرا اختلاف صرف طریقہ کار میں تھا نہ کہ نفس مسئلہ میں۔ جہاں تک مسجد کی شرعی نوعیت کا تعلق ہے اس بارے میں میرا نقطۂ نظر عین وہی تھا جو دوسرے حضرات کا رہا ہے۔ البتہ میرا کہنا تھا کہ اس معاملہ کو عدالت یا پُر امن گفت و شنید کے دائرہ تک محدود رکھنا چاہئے۔

حالات اب دو اور دو چار کی طرح ثابت کر چکے ہیں کہ جس نقطۂ نظر کی حمایت میں نے کی تھی وہی اس معاملہ میں صحیح ترین نقطۂ نظر تھا۔ حتی کہ اب تمام اصاغر و اکابر عملاً اسی روش کو اختیار کر چکے ہیں جس کی رہنمائی الرسالہ میں دی گئی تھی۔

## لیک بعد از خرابی بسیار

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ اگر راقم الحروف کی رائے پر عمومی طور پر عمل کیا جاتا تو یہ یقینی ہے کہ بابری مسجد کا تاریخی ڈھانچہ اپنی جگہ قائم رہتا، وہ کبھی توڑا نہ جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا انتہائی واقعہ ہمیشہ اشتعال انگیز فضا میں کیا جاتا ہے۔ معتدل فضا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی کسی مسجد پر حملہ کرے اور وہ اس کو توڑ ڈالے۔ اس نقطۂ نظر کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد جب حالات اعتدال پر آگئے اور جلسہ جلوس کی سیاست ختم ہو گئی تو اس کے بعد کوئی اور مسجد ڈھائی نہیں گئی۔ حالانکہ جیسا کہ معلوم ہے بابری مسجد کو توڑنے والے لوگ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء سے پہلے یہ اعلان کر رہے تھے کہ ملک میں تین سو ایسی مسجدیں ہیں جن کو توڑ کر ہمیں دوبارہ مندر بنانا ہے۔ یہ ساری سیاست اس طرح ختم ہو گئی جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

## سوال

آپ کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ ہندستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا ذمہ دار آپ مسلمانوں کو قرار دیتے ہیں کہ وہی اس کی ابتدا کرتے ہیں۔ دوسرے طبقہ کے لوگوں کو آپ اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ کیا یہ صحیح بات ہے، زیادہ تر مسلمانوں کی غلطیوں کی نشاندہی آپ کس لئے کرتے ہیں وضاحت فرمائیں۔ (سید نسیم الدین مجاہد، حیدر آباد)

## جواب

فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں میرا نقطۂ نظر کیا ہے اس کو سمجھنے کے لئے میری کتاب ''حل یہاں ہے'' کو دیکھا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر اس کے ''آغاز کلام'' کو۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۸۵ میں شائع ہوئی۔ یہ میرے اوپر بے بنیاد الزام ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان فساد کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس معاملہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک، یہ کہ فساد کا ابتدائی ذمہ دار کون ہے۔ دوسرے یہ کہ فساد کے مسئلہ کو حل کیسے کیا جائے۔ اس موضوع پر جو کچھ میں نے لکھا اس کا تعلق اس مسئلہ کے صرف ایک پہلو سے ہے وہ یہ کہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کون شروع کرتا ہے۔ دوسرے لکھنے اور بولنے والے لوگ زیادہ تر اسی پہلے سوال پر لکھتے اور بولتے ہیں جب کہ میرے نزدیک زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے نقصان سے بچایا جائے۔ فساد کس نے شروع کیا۔ یہ ایک خالص نظری نکتہ ہے۔ مگر فساد کیسے روکا جائے یہ ایک عملی سوال ہے اور اس کا براہ راست تعلق مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت سے ہے۔ مجھ کو اصلاً اسی سے دلچسپی ہے کہ مسلمانوں کی جان اور ان کے اموال محفوظ ہوں اور وہ اس ملک میں زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکیں۔

اس نقطۂ نظر سے جب میں سوچتا ہوں تو اس کا جواب مجھے قرآن میں واضح لفظوں میں ملتا ہے۔ قرآن کا وہ جواب یہ ہے: وان تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً (آل عمران ۱۲۰) قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے کید یا سازشی منصوبوں سے بچنے کا یقینی

فارمولا یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں صبر اور تقویٰ کا انداز اختیار کیا جائے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فساد زیادہ تر جلوس کے سوال پر ہوتا ہے۔ مسلمان اس کی روٹ بدلنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ہندو اپنے جلوس کی روٹ بدلنے پر راضی نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تکرار ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے فساد بن جاتی ہے۔ قرآن کی مذکورہ رہنمائی کی روشنی میں دیکھئے تو اس مسئلہ کا حل صبر و اعراض ہے نہ کہ ٹکراؤ۔ یعنی مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ جلوس کے معاملہ میں نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کریں۔ جلوس کا مسلم محلّہ سے گزرنا صرف ایک وقتی مسئلہ ہوتا ہے۔ جلوس کے دونوں طرف ہمیشہ پولیس موجود ہوتی ہے جو اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ جلوس کے لوگ محلّہ کے اندر داخل نہ ہوں، وہ سڑک سے گزرتے ہوئے آگے چلے جائیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہر موقع صرف چند منٹ کے صبر و اعراض کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اگر مسلمان ایسے موقع پر تھوڑی دیر کے لئے صبر و اعراض کا ثبوت دیں تو انہیں بیک وقت دو فائدے حاصل ہوں گے: ایک صبر کا ثواب جو قرآن کے الفاظ میں بے حساب حد تک ایمان والوں کو ملتا ہے (الزمر ۱۰)۔ دوسرا فائدہ یہ کہ ان کا یہ وقتی اعراض فرقہ وارانہ فساد کے بم کو پھٹنے سے پہلے ہی ڈیفیوز کر دے گا۔ اور مسلمان جان و مال کے نقصان سے بچ جائیں گے۔ جو لوگ ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ الرسالہ میں بار بار ایسی واقعاتی مثالیں شائع کی جاتی رہی ہیں جب کہ صرف صبر و اعراض کرنے کی وجہ سے فرقہ وارانہ فساد ٹل گیا اور مسلمان جان و مال کے نقصان سے مکمل طور پر محفوظ رہے۔ اس معاملہ کی مزید تفصیل ہماری کتاب (حل یہاں ہے) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اب اس مسئلہ کو لیجئے کہ اس معاملہ میں الرسالہ میں جو مضامین آتے ہیں ان میں زیادہ تر مسلمانوں کی کوتاہیوں کا ذکر ہے اس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ یہی قرآن کا اسلوب ہے۔ قرآن میں ایک مستقل معاشرتی اصول یہ بتایا گیا ہے کہ تم پر (دوسروں کی طرف سے) جو مصیبت بھی آتی ہے وہ صرف تمہارے اپنے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے (الشوریٰ ۳۰)۔ اسی اصول کی روشنی میں قرآن میں کم از کم دو بار صحابہ کو ان کی داخلی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی گئی جب کہ

معاملہ بظاہر نہ صرف یکطرفہ تھا بلکہ اغیار کے ظلم وزیادتی کا ثبوت بھی وہاں موجود تھا۔

یہ دونوں حوالے غزوۂ احد و حنین سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ معلوم ہے کہ غزوۂ احد سراسر قریش کی ظالمانہ کارروائیوں کی بناپر پیش آیا تھا۔ان کی یکطرفہ جارحیت اسی سے ثابت ہے کہ وہ مکہ سے اقدام کرکے مدینہ پہنچے اور یہاں آکر بلا سبب مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے جس کے نتیجہ میں احد کی جنگ پیش آئی۔اس میں مسلمانوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔احد کے اس واقعہ پر قرآن میں تبصرہ نازل ہوا تو اس میں قریش کے خلاف سخت بیان دینے کے بجائے خود اہل ایمان کو تنبیہ کی گئی قرآن میں ارشاد ہوا کہ یہ دراصل تمہارا باہمی نزاع (آل عمران ۱۵۲) تھا جس کی بناپر تم کو احد کے موقع پر جان ومال کا نقصان اٹھانا پڑا۔

دوسرا واقعہ وہ ہے جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوہ حنین کہا جاتا ہے۔جیسا کہ معلوم ہے غزوہ حنین قبیلہ ہوازن کی یکطرفہ جارحیت کے نتیجہ میں پیش آیا تھا۔اس موقع پر بھی مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر قرآن میں جب غزوہ حنین پر تبصرہ نازل ہوا تو دوبارہ یہی ہوا کہ جارح قبیلہ کے خلاف بیان دینے کے بجائے خود اہل ایمان کو تنبیہ کی گئی۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حنین کے دن تمہارے اندر عُجب اور ناز (التوبہ ۲۵) پیدا ہو گیا تھا اور یہی تمہارے لئے نقصان کا سبب بنا۔

یہی قرآنی اسلوب ہے جس کو میں اپنی تحریروں میں اختیار کرتا ہوں۔اگر فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں یہ کہنا ہو کہ اس کو شروع کرنے والا کون تھا تو میرا جواب بھی وہی ہوگا جو دوسرے مسلم رہنماؤں کا جواب ہوتا ہے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، اس طرح کے معاملات میں میرے سامنے یہ سوال ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جان ومال کو کیسے محفوظ کیا جائے اور جب میں اس دوسرے سوال پر غور کرتا ہوں تو میں مجبور ہوتا ہوں کہ قرآن کی روشنی میں بات عرض کروں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

سوال

میرے بھائی صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ آج کل کے مسلمانوں کو کس قسم کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ میں نے ان کو یہ جواب دیا کہ آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی

ہے کہ مسلمانوں کو حقیقت پسند بنایا جائے مگر وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ براہ کرم آپ اس کا جواب عنایت فرمائیں اور اس مسئلہ کو واضح کریں۔ (صوفیہ حیدر، بتیا، بہار)

جواب

آپ نے مذکورہ سوال کا بالکل درست جواب دیا۔ رہنمائی کے سلسلہ میں صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی نظری یا تاریخی باتوں کو جانے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ زمانی حالات کیا ہیں اور زمانی حالات کے اعتبار سے لوگوں کو کس قسم کی رہنمائی دینے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں ایک سبق آموز حوالہ یہ ہے کہ ایک عالم نے ایک بار فتویٰ دیا کہ المسح علی الخفین واجبٌ (خفین پر مسح کرنا واجب ہے) لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اس کو وجوب کا درجہ کیوں دیا، جب کہ یہ ایک رخصت کا معاملہ ہے۔ عالم نے جواب دیا کہ موجودہ زمانہ میں لوگ خفین پر مسح کرنے میں کراہت محسوس کرنے لگے تھے، اس لئے میں نے اس کی اہمیت پر زور دینے کے لئے یہ فتویٰ دیا۔

اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں بھی یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ان کے اندر کیا کمی آگئی ہے کہ ترقی کی دوڑ میں وہ دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ حقیقت پسندانہ طرز فکر (realistic approach) ان کے اندر تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان عام طور پر جذباتی انداز میں سوچنے لگے ہیں۔ وہ اکثر جذباتی فیصلہ کے تحت اقدام کرتے ہیں۔ حالات کا گہرا تجزیہ اور تعمیری منصوبہ بندی کا مزاج ان میں باقی نہیں رہا۔ یہی ان کے موجودہ مسائل کا اصل سبب ہے۔ ایسی حالت میں موجودہ مسلمانوں کے لئے جس رہنمائی کی ضرورت ہے وہ یقینی طور پر یہی ہے کہ ان کے اس مزاج کی تصحیح کی جائے۔ ان کے اندر سے جذباتیت کا مزاج ختم کیا جائے۔ اس کے بجائے ان کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کیا جائے۔

اس مزاج کا ایک اور تباہ کن نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان عددی اعتبار سے بہت

بڑی طاقت ہیں، مگر اپنی بے اتحادی کی بنا پر وہ صرف ایک کمزور قوم بنے ہوئے ہیں۔ اس بے اتحادی کا واحد سبب یہی جذباتیت ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ معمولی اختلاف پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اختلاف کے وقت اپنا اعتدال کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ اس شخص کے دشمن بن جاتے ہیں جو کوئی ایسی بات کہے جس سے وہ اختلاف رکھتے ہوں۔

فرق اور اختلاف ایک فطری حقیقت ہے۔ وہ ہر سماج میں اور ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرق وہ اختلاف کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ صحابہؓ کرام کے زمانہ میں بھی ان کے اندر بہت سے اختلاف تھے۔ موجودہ دنیا میں اتحاد ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ لوگوں کے اندر اختلاف کو برداشت کرنے کا مزاج ہو۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا، کیوں کہ غیر اختلافی سماج تو دنیا میں کبھی بنایا ہی نہیں جاسکتا۔

سوال

قرآن میں آیا ہے کہ تم صبر کرو جس طرح اولوالعزم انبیاء نے صبر کیا اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ (الاحقاف ۳۵) اس کا مطلب کیا ہے، اس کی تفصیل فرمائیں۔

(اسجد نواز صابری، ململ، بہار)

جواب

عزم کا مطلب پختہ ارادہ (determination) ہے۔ یعنی اپنے مقصد پر پوری طرح جمے رہنا، کسی بھی چیز کا اثر لے کر اپنے مقصد سے منحرف نہ ہونا۔ اس آیت میں داعی کا کردار بتایا گیا ہے۔ داعی سے جو کردار مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے خواہ کتنا ہی زیادہ منفی ردّعمل کا اظہار ہو، مگر داعی اپنے مثبت رویّہ پر قائم رہے۔ مدعو اگر اشتعال دلائے تب بھی داعی مشتعل نہ ہو۔ مدعو اگر قابل نفرت سلوک کرے تب بھی داعی اس کا خیر خواہ بنا رہے۔ مدعو اگر نزاع چھیڑے تب بھی داعی اس سے اعراض کرتے ہوئے لڑائی کی نوبت نہ آنے دے۔ یہی عزیمت ہے اور دعوت کا کام اس عزیمت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

# ایک خط

برادر محترم جناب یوسف نورانی صاحب　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۲۸ جنوری ۲۰۰۱ کو ٹیلی فون پر گفتگو کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ٹیلی فون پر میں نے جس مسئلہ کا ذکر کیا تھا اس کی مزید تفصیل یہاں درج ہے۔

قدیم مکہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی کی حیثیت سے اپنا پیغام پیش کیا تو وہاں کے سرداروں نے آپ کی دعوت کو رد کر دیا۔ وہ لوگوں سے یہ کہتے کہ محمد صرف ایک بشر ہیں، ان کے اور تمہارے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اس طرح وہ لوگوں کو شبہہ میں ڈالتے اور ان کو شک میں مبتلا کرتے۔ وہ کہتے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں اور اللہ کی طرف سے آئے ہیں تو اللہ نے کیوں نہ ایسا کیا کہ وہ بشر کے بجائے اپنے فرشتہ کو ہمارے پاس بھیج دیتا تاکہ ہمیں اس کو نمائندۂ الٰہی سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ (تفسیر القرطبی ۶/۳۹۴)

ان کے اس اعتراض کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ: اور اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو اس کو بھی آدمی بناتے اور ان کو اسی شبہہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں (الانعام ۹)۔ اس آیت میں ایک اہم سنت الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ قرآن کے الفاظ میں التباس (ambiguity) کا قانون ہے۔ یعنی یہاں ہر چیز کے ساتھ ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) لگا ہوا ہے، حتی کہ خود قرآن کے ساتھ بھی۔ اس دنیا میں یہی آدمی کا امتحان ہے کہ وہ شبہہ کے اس پردہ کو پھاڑے، وہ اس پردہ کو ہٹا کر حقیقت کا یقینی مشاہدہ کر سکے۔ اسی امتحان پر آخرت میں آدمی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔ جو شخص موجودہ دنیا میں شبہہ کا پردہ پھاڑنے میں کامیاب ہوا وہ آخرت میں بھی کامیاب ہے۔ اور جو شخص یہاں شبہہ کا پردہ پھاڑنے میں ناکام رہا، وہ آخرت میں بھی ناکام رہے گا۔

مثال کے طور پر موجودہ قرآن اپنی نزولی ترتیب پر نہیں ہے بلکہ وہ توقیفی ترتیب پر ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس مسئلہ میں الجھ جائے تو وہ قرآن پڑھنے کے باوجود قرآن کی ہدایت سے محروم رہے گا۔ اسی طرح دنیا میں مصیبت (suffering) کا مسئلہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس مسئلہ میں الجھ جائے تو وہ خدا کی حکیمانہ تخلیق کے بارے میں مشتبہ ہو جائے گا، وہ ذہنی انتشار (confusion) میں مبتلا ہو کر یقین کی نعمت سے محروم رہے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس مسئلہ کا معین (specific) جواب ڈھونڈھنے لگے کہ مرنے کے بعد عورت یا مرد کے اوپر کیا احوال پیش آتے ہیں تو وہ معین صورت میں اپنے سوال کا جواب تو نہ پاسکے گا، البتہ وہ خود ایک قسم کا ذہنی مریض بن جائے گا جس کا علاج اس دنیا میں ممکن ہی نہ ہو، وغیرہ۔

نظام فطرت میں التباس کا یہ قانون بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں سچائی کی پہچان کے لئے وہ طریقہ رکھا ہے جس کو ایجوکیشن کی اصطلاح میں تلاش کا طریقہ (discovery method) کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تمام چیزیں کسی نہ کسی اعتبار سے مشتبہ حالت میں ہیں۔ اشتباہ (doubt) کی یہ حالت قیامت سے پہلے ہرگز ختم ہونے والی نہیں۔ آدمی کے لیے واحد انتخاب یہ ہے کہ وہ عقلِ سلیم سے کام لے کر اشتباہ کے پردہ کو پھاڑے، وہ شبہہ کے باوجود یقین تک پہنچے۔ وہ اجمال میں صراحت کو پڑھ لے۔

اس معاملہ میں کامیاب ہونے کے لیے قرآن وحدیث میں چند اصول بتائے گئے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ آدمی اس حقیقت واقعہ کا اعتراف کرے کہ اس کو علم قلیل (بنی اسرائیل ۸۵) دیا گیا ہے، اس کو علم کثیر عطا نہیں ہوا۔ اسی طرح حدیث میں اس کا ایک اصول ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلاتبحثوا عنها (مشکاة ۱/۶۹) یعنی اللہ نے کچھ چیزوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے بغیر اس کے کہ وہ اس کو بھولا ہو، پس تم ان چیزوں کے بارے میں بحث نہ کرو۔ اسی لئے ایک عالم نے کہا ہے: ابهموا ما ابهمه الله (اس چیز کو مبہم رکھو جس کو اللہ نے مبہم رکھا ہے)۔ یہ موجودہ دنیا میں گویا مطالعہ کی کلید ہے۔ خواہ علم دین کا

معاملہ ہو یا سیکولر علوم کا، دونوں ہی معاملہ میں یہ کلیدی اصول یکساں طور پر اہمیت رکھتا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ فلسفہ پچھلے پانچ ہزار سال سے حقیقت کائنات کا مطالعہ کر تا رہا ہے مگر اس کو مکمل طور پر ناکامی ہوئی۔ اس کے برعکس سائنس نے تین سو سال کے عرصے میں ہزاروں کامیابیاں حاصل کرلیں۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ فلسفہ کیسے (how) اور کیوں (why) میں فرق نہ کر سکا۔ اس نے دونوں کو یکساں طور پر جاننا چاہا جب کہ ان میں سے ایک کو جاننا انسان کے لئے ممکن ہے اور دوسرے کو جاننا انسان کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے برعکس سائنس نے یہ کیا کہ "کیوں ہے" کے سوال کی بابت اجمالی علم پر قناعت کرتے ہوئے اس نے "کیسے ہے" کے سوال پر اپنی ساری توجہ لگادی۔ اس کا نتیجہ شاندار کامیابی کی صورت میں نکلا۔

اسی طریقِ مطالعہ (methodology) کو ہمیں دین کو سمجھنے کے لئے بھی استعمال کرنا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، قرآن کی محکم آیات کو تو ہمیں تفصیل کے ساتھ جاننے کی کوشش کرنا ہے۔ مگر قرآن کی وہ باتیں جو متشابہات سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں مختصر اور مبہم علم پر قناعت کرنا ہے (آل عمران ۷)۔ نفسیاتی اعتبار سے کسی آدمی کی سب سے زیادہ اہم صفت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس کے اندر صحتِ فکر (sound thinking) پائی جائے۔ صحت فکر کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ آدمی یہ جانے کہ کس بات کو اسے اپنی سوچ کا موضوع بنانا ہے اور وہ کون سی بات ہے جس میں اسے اپنے ذہن کو زیادہ مصروف کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی حکمت کسی آدمی کو اعلیٰ فکر عطا کرتی ہے جو اس دنیا میں بلاشبہہ سب سے بڑی نعمت ہے۔

اس دنیا میں حق کی سچی معرفت صرف اس کے لئے ممکن ہے جو مطالعہ کی اس تقسیم پر راضی ہو، جو شخص اس تقسیم پر اپنے آپ کو راضی نہ کر سکے، اس کے لئے موجودہ دنیا میں ذہنی انتشار کے سوا اور کچھ نہیں۔ ذہنی انتشار بلاشبہہ اتنی بڑی محرومی ہے کہ اگر اس کو ذہنی خودکشی کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

۳۰ جنوری، ۲۰۰۱ | دعاگو وحیدالدین

۱ انگریزی کی نئی کتاب ''اسلام ری ڈسکورڈ''(Islam Rediscovered) چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ وہ تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پچیس ابواب ہیں۔ یہ کتاب سرچ فار ٹرو (Search for Truth) کے عنوان سے شروع ہوتی ہے۔ اور ترتیب وار مختلف ابو سے گزرتی ہوئی آخری باب پر ختم ہوتی ہے جس کا عنوان ہے حق کی دریافت کی ایک مثال

A Case of Discovery

یہ پوری کتاب جدید سائنٹفک اسلوب پر لکھی گئی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ تک اسلام پیغام پہنچانے کے لئے یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے، انشاءاللہ دور جدید کے انسار تک مؤثر انداز میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے یہ کتاب بے حد مفید ہو گی۔

۲ ۲۸ جنوری ۲۰۰۱ کو گاندھی سمرتی اور درشن سمتی International Centre of Gandhian Studies and Research) میں تین روزہ سیمنار ہوا۔ اس کی دعوت ۲۸ جنوری ۲۰۰۱ کو صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اسلام پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا عنوان یہ تھا:

The Role of Islam in the Emerging Scenario.

تین گھنٹہ کا یہ پروگرام صرف اسلام کے موضوع پر تھا۔ تقریر کے بعد سوال وجواب سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ چنانچہ جو لو اسلام کو اختیار کرتے ہیں ان کا احساس یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خود اپنی فطرت کے دین اختیار کر لیا ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ ہم تو اسلام کو مسلمانوں کی تصویر میں دیکھتے ہیں اور آپ کی بتائی ہوئی تصویر سے مختلف ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ مطالعہ کا طریقہ نہیں۔ اگر آپ ڈیماکریسی کا علمی مطالعہ کریں تو کیا آپ ایسا کریں گے کہ بہار لالو پرشاد اور رابڑی دیوی کے نمونہ کو لے کر ڈیماکریسی کے بارے میں رائے قائم کریں.

۳ ۲۹ جنوری ۲۰۰۱ کو بوسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر مارک لنڈلے (Mark Lindley) نے صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی اور اپنی ایک زیر تیاری کتاب کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کی اس کتاب میں ایک باب اسلام پر ہے۔ انہیں اسلام سے متعلق ضروری معلومات دی گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکہ میں عام تاثر یہ ہے کہ اسلام ایک تشدد کا مذہب ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرایا گیا۔ انٹرویو کے دوران وہ تمام باتوں کو اپنے کمپیوٹر (laptop) کے ذریعہ نوٹ کرتے رہے۔

۴ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک امریکی ادارہ انٹرنیشنل سوسائٹی اگینسٹ ڈاوری اینڈ برائڈ برننگ (International Society Against Dowry & Bride Burning) کے تحت دو روزہ سیمنار ہوا۔ اس کی دعوت پر ۳۰ جنوری ۲۰۰۱ کو صدر اسلامی مرکز نے اس کے اجلاس میں شرکت کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ زیادہ تر لوگ اس مسئلہ پر جہیز وغیرہ کے خلاف آواز اٹھانے کو کام سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک زیادہ مفید بات یہ ہے کہ عورت کی اہمیت اور افادیت کو مردوں کے ذہن نشین کرایا جائے۔ عورت ایک مرد کے لئے بہترین رفیقۂ حیات ہے۔ مرد اگر عورت کو جان لے تو اپنے آپ جہیز کا اور جلانے مارنے کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد مرد کے لئے عورت ایک سرمایہ (asset) بن جائے گی نہ کہ ایک بوجھ (liability)۔ اس سلسلہ میں مزید بتایا گیا کہ الرسالہ مشن کے تحت اس کا کامیاب تجربہ کیا جارہا ہے۔

۵ ۳۱ جنوری ۲۰۰۱ کو اکھل بھارتیہ یووا مورچہ کی طرف سے جنتر منتر روڈ (نئی دہلی) میں ایک جلسہ کیا گیا۔ اس کا موضوع آتنک واد تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آتنک واد کیا ہے، آتنک واد بچھو واد ہے، آتنک واد بھیڑیا واد ہے۔ یہ انسان کے لئے شرم کی بات ہے کہ وہ آتنک وادی ہو۔ ہر انسان خدا کی تخلیق ہے۔ ہر انسان خدا کا ایک پھول ہے۔ دنیا کے باغ میں پھول اور کانٹے ایک ساتھ

رہتے ہیں۔ پھول اور کانٹے آپس میں تشدد نہیں کرتے۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ پھول اور پھول ایک ساتھ امن کے ساتھ نہ رہ سکیں۔ جو آدمی دوسرے آدمی کو پھول کے روپ میں دیکھے وہ خود بھی پھول بن جائے گا۔ اور جو انسان دوسرے انسان کو کانٹے کے روپ میں دیکھے وہ خود ایک کانٹا بن جائے گا۔ آتنک وادی پہلے اپنے آپ کو مارتا ہے، اس کے بعد دوسرے انسان کو۔

۶ کیتھولک کیتھیڈرل (گول مارکیٹ، نئی دہلی) میں ۹ فروری ۲۰۰۱ کو ایک پروگرام ہوا۔ وہ گجرات کے زلزلہ ۲۶ جنوری ۲۰۰۱ کے اوپر تھا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اسلام کی نمائندگی کے لئے صدر اسلامی مرکز کو بلایا گیا تھا۔ انہوں نے اس موضوع پر مختصر انداز میں اظہار خیال کیا۔ اور دعا کی کہ اللہ گجرات کے ان پریشان حال لوگوں کو صبر اور حوصلہ عطا فرمائے۔ اور ان کو دوبارہ ایک نئی زندگی کی تعمیر کے قابل بنائے۔

۷ گجرات کے زلزلہ (۲۶ جنوری ۲۰۰۱) کے حادثہ پر ۱۱ فروری ۲۰۰۱ کو گاندھی درشن (راج گھاٹ، نئی دہلی) کے ہال میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کے چیرمین سابق صدر جمہوریہ مسٹر آر وینکٹ رمن تھے۔ اس میں مختلف ملکی تنظیموں کے نمائندے اور ریلیف کے لئے کام کرنے والے لوگوں نے شرکت کی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز بھی اس میں شریک ہوئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ گجرات کا زلزلہ ہمارے لئے ایک بے حد بھیانک واقعہ تھا۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کہ اس موقع پر پورے ملک نے باہمی اختلاف کو بھلا کر تعاون کیا ہے، انہوں نے بتایا کہ اس طرح کے معاملے میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر شخص اپنے بس بھر خدمت کرے، جس آدمی کے پاس جسمانی طاقت ہو وہ اپنی جسمانی طاقت سے لوگوں کی خدمت کرے۔ جس کے پاس پیسہ ہو وہ اس میں اپنا پیسہ دے۔ اگر کسی کے پاس دینے کے لئے اس قسم کی کوئی چیز نہ ہو تب بھی اس کا فرض ہے کہ وہ دل سے مصیبت زدہ لوگوں کے لئے تڑپے۔ وہ آنسو بہا کر ان کے لئے خدا سے دعا کرے۔

## Other Goodword Books

A Simple Guide to Islam *Farida Khanam* .. 125.00
A Simple Guide to Muslim Prayer *Muhammad Mahmud Al-Sawwat* ........ 195.00
A Simple Guide to Islam's Contribution to Science *Maulvi Abdul Karim* ........ 95.00
Arabic-English Dictionary for Advanced Learners (PB) *J.G. Hava* ........ 350.00
The Spread of Islam in the World *Prof. T.W Arnold* ........ 250.00
A Handbook of Muslim Belief *Dr. Ahmad A Galwash* ........ 295.00
The Muslims in Spain *Stanley Lane-Poole* ........ 150.00
The Moriscos of Spain *Henry Charles Lea* ........ 295.00
The Story of Islamic Spain *Syed Azizur Rahman* ........ 295.00
Spanish Islam (A History of the Muslims in Spain) *Reinhart Dozy* ........ 395.00
The Quran, Bible and Science *Dr. Maurice Bucaille* ........ 195.00
Islamic Medicine *Edward G. Browne* ........ 145.00
Islam and the Divine Comedy *Miguel Asin* ........ 195.00
Travels of Ibn Jubayr *Tr. J.C. Broadhurst* .... 295.00
The Arabs in History *Prof. Bernard Lewis* .... 95.00
Decisive Moments in the History of Islam *Muhammad Abdullah Enan* ........ 195.00
My Discovery of Islam *Muhammad Asad* ... 250.00
Islam At the Crossroads *Muhammad Asad* .. 95.00
The Spread of Islam in France *Michel Reeber* ........ 75.00
The Islamic Art and Architecture *Prof. T.W. Arnold* ........ 195.00
The Islamic Art of Persia *Ed. A.J. Arberry* . 195.00
The Hadith for Beginners *Dr. Muhammad Zubayr Siddiqui* ........ 195.00
How Greek Science Passed to Arabs *De Lacy O'Leary* ........ 195.00
Islamic Thought and its Place in History *De Lacy O'Leary* ........ 195.00
One Religion *Zaheer U. Ahmed* ........ 95.00
Muhammad. The Hero As Prophet *Thomas Carlyle* ........ 75.00
A History of Arabian Music *Henry George Farmer* ........ 195.00
A History of Arabic Literature *Clément Huart* ........ 250.00
The Qur'an for Astronomy *Prof. Waqar Husaini* ........ 250.00
Ever Thought About the Truth? *Harun Yahya* ........ 145.00
Crude Understanding of Disbelief *Harun Yahya* ........ 125.00
The Miracle in the Ant *Harun Yahya* ........ 295.00
The Miracle in the Immune System *Harun Yahya* ........ 295.00
Allah is Known Through Reason *Harun Yahya* ........ 345.00
The Basic Concepts in the Quran *Harun Yahya* ........ 145.00
The Moral Values of the Quran *Harun Yahya* ........ 125.00
The Beautiful Commands of Allah *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 125.00
The Beautiful Promises of Allah *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 175.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 250.00
After Death, Life! *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 195.00
Living Islam: Treading the Path of Ideal *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 250.00
A Basic Dictionary of Islam *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 250.00
The Muslim Marriage Guide *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 250.00
GCSE Islam–The Do-It-Yourself Guide *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 295.00
The Beloved Prophet *Ruqaiyyah Waris Maqsood* ........ 195.00
The Soul of the Quran *Saniyasnain Khan* 125.00
Presenting the Quran *Saniyasnain Khan*... 125.00
The Wonderful Universe of Allah *Saniyasnain Khan* ........ 85.00
The Quran *Tr. T.B. Irving* ........ 245.00
Selections from the Noble Reading *T.B. Irving* ........ 95.00
The Koran *Tr. M.H. Shakir* ........ 125.00
Heart of the Koran *Lex Hixon* ........ 195.00
Muhammad: A Mercy to all the Nations *Qassim Ali Jairazbhoy* ........ 250.00
The Sayings of Muhammad *Sir Abdullah Suhrwardy* ........ 75.00
The Life of the Prophet Muhammad *Mohd. Marmaduke Pickthall* ........ 75.00
History of the Prophet Muhammad *Philip K. Hitty* ........ 75.00
A-Z Steps to Leadership *Abdul Ghani Ahamed Barrie* ........ 95.00
The Essential Arabic *Rafi'el-Imad Faynan* .. 175.00

### Children's Books

Tell Me About the Prophet Muhammad *Saniyasnain Khan* ........ 345.00
Tell Me About the Prophet Musa *Saniyasnain Khan* ........ 345.00
Tell Me About Hajj *Saniyasnain Khan* ........ 295.00
Life Begins: Quran Stories for Little Hearts (PB) *Saniyasnain Khan* ........ 70.00
The Ark of Nuh : Quran Stories for Little Hearts (HB) *Saniyasnain Khan* ........ 125.00
The Ark of Nuh : Quran Stories for Little Hearts (PB) *Saniyasnain Khan* ........ 70.00
The First Man : Quran Stories for Little Hearts (HB) *Saniyasnain Khan* ........ 125.00
The First Man : Quran Stories for Little Hearts (PB) *Saniyasnain Khan* ........ 70.00
The Origin of Life (Colouring Book) *Saniyasnain Khan* ........ 40.00
The Ark of Nuh and the Animals (Colouring Book) *Saniyasnain Khan* ........ 40.00
The First Man on the Earth (Colouring Book) *Saniyasnain Khan* ........ 40.00
The Ark of Nuh and the Great Flood (Sticker Book) *Saniyasnain Khan* ........ 125.00

## Books by Maulana Wahiduddin Khan

| Title | Price |
|---|---|
| Islam Rediscovered | 195.00 |
| A Treasury of the Quran | 75.00 |
| The Quran for All Humanity | 75.00 |
| The Quran: An Abiding Wonder | 145.00 |
| The Call of the Qur'an | 95.00 |
| Muhammad: A Prophet for All Humanity | 195.00 |
| Words of the Prophet Muhammad | 75.00 |
| An Islamic Treasury of Virtues | 195.00 |
| Islam and Peace | 150.00 |
| Introducing Islam | 195.00 |
| The Moral Vision | 145.00 |
| Principles of Islam | 145.00 |
| Indian Muslims | 65.00 |
| God Arises | 125.00 |
| Islam: The Voice of Human Nature | 40.00 |
| Islam: Creator of the Modern Age | 70.00 |
| Woman Between Islam and Western Society | 145.00 |
| Woman in Islamic Shari'ah | 125.00 |
| Islam As It Is | 70.00 |
| Religion and Science | 45.00 |
| Tabligh Movement | 40.00 |
| Hijab in Islam | 20.00 |
| The Way to Find God | 25.00 |
| The Teachings of Islam | 50.00 |
| The Good Life | 45.00 |
| The Garden of Paradise | 45.00 |
| The Fire of Hell | 45.00 |
| Islam and the Modern Man | 25.00 |
| Uniform Civil Code | 20.00 |
| Man Know Thyself | 20.00 |
| Muhammad: The Ideal Character | 20.00 |
| Polygamy and Islam | 20.00 |
| Concerning Divorce | 20.00 |